اسباق تاریخ

اسلامی تاریخ کے سبق آموز صفحات

مولانا وحید الدّین خاں

Asbaq-e-Tareekh
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1999

This book does not carry a copyright.

Distributed by
AL-RISALA
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

Distributed in U.K. and Europe by
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

ALIF INTERNATIONAL
109 Kings Avenue, Watford, Hertfordshire WDI 7SB
Tel. 01923-240844 Fax 01923-237722
e-mail: bandali@alif.co.uk

Distributed in U.S.A. by
THE BESTSELLERS
61-38, 168 St. P.O. Box: 650654,
Fresh Meadows, NY 11365-00654
Tel. 718-3594861 Fax: 718-3594446
e-mail: akhan72252@aol.com

CRESCENT BOOKS
2221 Peachtree Road, Suite D109, Atlanta, GA 30309
Tel. 770-6626970 Fax 404-351 2832

Printed in India

بسم الله الرحمن الرحيم

دیباچہ

زیر نظر مجموعہ عام معنوں میں کوئی مرتب کتاب نہیں۔ وہ مختلف اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ماہنامہ الرسالہ میں چھپتے رہے ہیں۔ یہاں ان کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیا گیا۔ ان مضامین کا مشترک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم تاریخ کے مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر واقع میں کوئی ایسی نصیحت ہے جو اس کو عمومی بنا دیتی ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً فخر کے جذبہ کی تسکین حاصل کرنا یا ماضی کی معلومات کے طور پر اس کو دیکھنا۔ زیر نظر کتاب میں، اس کے بجائے تاریخ کا مطالعہ سبق اور نصیحت کے لئے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقصد کے تحت تاریخ کو پڑھنا بے حد اہم ہے۔ اور اگر اس سے صحیح تاثر لیا جائے تو وہ زندگی کی تعمیر کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

بد قسمتی سے ہماری مدون تاریخ اس نہج پر نہیں لکھی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں تاریخ کو زیادہ تر جنگ وفتوحات کی داستان کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ یہی انداز ساری دنیا میں پھیل گیا۔ قدیم زمانہ میں تاریخ کے موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ تقریباً سب کی سب بادشا نامہ یا جنگ نامہ تھیں۔ یہی مروجہ انداز مسلمانوں کے درمیان بھی غیر شعوری طور پر داخل ہو گیا۔

اسلام کے ظہور کے بعد ہزار سال تک اسلام کی تاریخ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں ہیں مگر وہ زیادہ تر فتوحات مسلمین یا جنگ نامۂ اسلام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلا شخص جس نے اسلامی تاریخ کی اس کمی کو محسوس کیا وہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۷۳۲۔۸۰۸ھ) تھا۔ اس نے نئے اسلوب پر تاریخ نگاری کے اصول وضع کئے جو اس کی

مشہور کتاب مقدمہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس نے ان اصولوں پر تاریخ کو مرتب کرنے کی کوشش کی تاہم وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اس کمی نے اسلام کی تاریخ کو بظاہر جنگ وفتوحات کی تاریخ بنادیا۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام ایک شمیری مذہب ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی تاریخ، وسیع تر معنوں میں حیات انسانی کی تاریخ ہے۔ مگر عملاً وہ کشور کشائی کی تاریخ بن گئی۔ اسلام نے اپنی چودہ سوسالہ تاریخ میں کروروں انسانوں کو متاثر کیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کا سبب بنا۔ انسانی زندگی میں ایسا ہمہ گیر انقلاب صرف شمشیر کے ذریعہ وجود میں نہیں آسکتا۔

مورخین عام طور پر اسلامی تاریخ کے جس پہلو سے سب سے زیادہ متاثر ہیں وہ اسلام کی استثنائی نوعیت کی انتہائی تیز رفتار جغرافی توسیع ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے دوست اور دشمن دونوں میں سے کوئی بھی اس واقعہ سے صحیح سبق نہ لے سکا۔ اسلام کے معترفین نے اسلامی تاریخ کے اس واقعہ سے زیادہ تر فخر کی غذالی۔ اس کے برعکس اسلام کے معترضین نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام کی اصل طاقت اس کی تلوار ہے نہ کہ اس کی آئیڈیالوجی۔

زیر نظر کتاب گویا کہ اسلام کی تاریخ کا درست زاویہ سے مطالعہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس اعتبار سے شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ غلط طریقہ مطالعہ کی تصحیح کی طرف ایک قدم ہے۔ اگرچہ وہ محدود بھی ہے اور غیر مرتب بھی۔

وحیدالدین

دہلی، ۲۰ نومبر ۱۹۹۸

فہرست

پہلا باب ۱۲
جماعت صحابہ ۱۴
برتر تدبیر ۱۵
زمانی فرق ۱۶
دو نمونے ۱۷
دو انسان ۱۸
اسلام کے سفیر ۲۰
رہنما کی اہمیت ۲۱
غلط فہمی ۲۲
زیادہ ثواب ۲۴
عوام و خواص ۲۶
باشعور افراد ۲۸
اتحاد کی شرط ۳۰
مقام کیسے ملا ۳۲
انقلابی فیصلہ ۳۵
یہ حاملین اسلام ۳۶
خوف خدا ۳۷
قدردانی ۳۸
یہود کے نقش قدم پر ۳۹
اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے ۴۴
توبہ نے طاقت ور بنادیا ۴۵
معیار کی تبدیلی ۴۷
حکم آنے کے بعد ۴۸
جب آدمی عقل کھودے ۵۰
متحدہ محاذ کی سیاست ۵۱
سب سے بڑی ضمانت ۵۵
امتحان کی قیمت ۵۷
انصاف کا طریقہ ۵۹
سورہ نور کی روشنی میں ۶۲
الزام کافی نہیں ۶۵
اپنی پہچان ۶۷
آیت فتنہ ۶۹
اقدام سے پہلے تحقیق ضروری ۷۱
سچائی کا زور ۷۴

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ۷۶
خدا کا کلمہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا ۷۸
ایک خاندانی جھگڑا ۸۰
حیوانیت کی سطح پر ۸۴
کتنا فرق ۸۶
الٹا نتیجہ ۸۸
مردہ لوگ ۹۱
خدا کی سنت ۹۲
اکابر قوم ۹۵
دے کر پانا ۹۶
ایک واقعہ ۹۸
اعتراف ۱۰۰
غلطی کی اصلاح ۱۰۱
وہ بادشاہ ہو کر بھی ۱۰۳
عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے ۱۰۵
انسانوں کی ایک قسم یہ بھی ہے ۱۰۵
انسانی اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں ۱۰۶
سیاست کے لئے جوش و خروش ۱۰۷
یہ تھا مشرکین عرب کا کردار ۱۰۸
ایک واقعہ ۱۱۴
حبش کی ہجرت ۱۵
عصبیت کہاں تک لے جاتی ہے ۱۱۶
ان کے پاس ہر روش کے لئے ۱۱۸
عزت و ذلت ۱۲۱
کبھی ایسا ہوتا ہے ۱۲۱
سرسری مطالعہ ۱۲۵
اس میں آپ کے لئے سبق ہے ۱۲۶
لطیفہ ۱۲۸
دوسرا باب ۱۲۹
فطرت پر ۱۳۱
دو کردار ۱۳۲
حالات کے نتیجہ میں ۱۳۳
تعصب کی حد ۱۳۴
حکومتی منصب ۱۳۵
کتنا فرق ۱۳۷
قرآن سے تعلق ۱۳۸
تاریخ کا سبق ۱۳۹
اسلامی رواداری ۱۴۱

یہ بھی ممکن ہے ۱۴۲
بادشاہ بھی ۱۴۳
تعصب کی قیمت ۱۴۴
امامت کا راز ۱۴۵
تاریخ سبق دیتی ہے ۱۴۶
مغربی قومیں ۱۴۷
جب یہ نوبت آجائے ۱۴۸
دعوت سے غفلت ۱۴۹
تاریخ کا فتنہ ۱۵۰
عہدہ نہ ملنے پر ۱۵۱
آدمی بدل جاتا ہے ۱۵۲
محل سے کھنڈر ۱۵۳
منفی سیاست مہنگی پڑی ۱۵۴
موت کے وقت ۱۵۵
غلط استدلال ۱۵۶
عقل کی آنکھ سے ۱۵۷
ماضی اور حال ۱۵۸
ماضی اور حال کا فرق ۱۶۰
ترقی کا راز ۱۶۴
ظالم کے لئے کامیابی نہیں ۱۶۵
فتوحات کا راز ۱۶۶
تخریبی سیاست کا انجام ۱۶۸
تار تاری فتنہ اختلافی سیاست کا نتیجہ ۱۷۱
دو تاریخی تجربے ۱۷۵
اچھی زندگی ۱۸۰
اخلاص کافی نہیں ۱۸۱
اعلیٰ ظرفی ۱۸۳
علامتی سرزمین ۱۸۶
تعمیر، سیاست ۱۸۷
اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے ۱۹۱
الفاظ کا فتنہ ۱۹۲
دو قسم کے انسان ۱۹۳
غلط فہمی ۱۹۴
معاشی فراغت ۱۹۵
نازک مسئلہ ۱۹۶
یہ صحیح نہیں ۱۹۹
طارق بن زیاد ۲۰۰
یونانی علوم ۲۰۸

تاریخ کا سبق ۲۱۰
نصیحت کا اثر ۲۱۳
دو مثالیں ۲۱۴
دو تصویریں ۲۱۶
ایک عام برائی ۲۱۷
نصیحت ۲۱۸
پکار پر دوڑنے والے ۲۱۹
جب کرتب بازی کو ۲۲۰
بڑھیا کی دلیری ۲۲۱
اچھا گمان رکھئے ۲۲۲
تیسرا باب ۲۲۳
عصری تقاضے ۲۲۵
خود شکن بنئے ۲۲۶
صفحۂ عبرت ۲۲۷
بلند کردار ۲۲۹
ذمہ دار کون ۲۳۰
تاریخ سبق دیتی ہے ۲۳۲
کتنا فرق ۲۳۳
جدوجہد ۲۳۵
فساد کا ذمہ دار ۲۳۶
خدا کی مدد ۲۳۹
اسلام کے نام پر ۲۴۱
سبق آموز ۲۴۲
تاریخ پکارتی ہے ۲۴۴
اتفاق کا نتیجہ ۲۴۷
پہچان ۲۴۸
بڑاپن ۲۴۹
جاننا کافی نہیں ۲۵۰
بربادی کے باوجود ۲۵۱
قومی عظمت ۲۵۳
عروج زوال ۲۵۵
منفی تحریکیں ۲۵۶
چوتھا باب ۲۵۷
ایک مثال ۲۵۹
ماضی اور حال ۲۶۰
اخلاق کی طاقت ۲۶۱
اللہ کو بہت یاد کرو ۲۶۲
کل اور آج کا فرق ۲۶۳

جہاد کے نام پر ۲۶۴
تاریخ کا نوشتہ ۲۶۷
اسلام کا عطیہ ۲۶۸
قدردانی ۲۶۹
منفی جوش ۲۷۰
تھوڑا وقت زیادہ کام ۲۷۱
بے فائدہ باتیں ۲۷۲
کتنا فرق ۲۷۳
صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں ۲۷۴
ایک اہم کتاب ۲۷۵
ملت کا سرمایہ ۲۷۶
کام سے پہلے کام کی بنیاد تیار کیجئے ۲۷۷
بے فائدہ سیاست ۲۷۸
جذباتی نہ بنو ۲۷۹
عبرت ناک ۲۸۰
خبر غلط تھی ۲۸۱
نظام تعلیم ۲۸۳
کیسی عجیب غفلت ۲۸۴
آہ یہ بے شعوری ۲۸۶
وہ مواقع جو استعمال نہ ہو سکے ۲۸۸
کیسا عجیب ۲۹۰
فلسطین: ایک علامت ۲۹۱
اسلام کے نام پر اسلام کا قتل ۲۹۴
اسلامی تخریب کاری ۲۹۶
ان کا مکمل انقلاب جزئی انقلاب ۲۹۷
انقلابی خوش خیالیاں ۲۹۹
عبرت کے لئے ۳۰۰
یہ خوش خیال مفکرین ۳۰۲
مدعو میں برتری کی نفسیات پیدا کرنا ۳۰۷
ضمیر۔ دنیا میں خدا کی عدالت ہے ۳۰۸
ہم کہاں ہیں ۳۰۹
نظام مصطفی کی نئی تعبیر ۳۱۰
الفاظ، الفاظ، الفاظ ۳۱۱
مسلمان: کل اور آج ۳۱۲
سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت ۳۱۴
سیاست کے ساتھ دینی خدمت ۳۱۶
جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں ۳۱۸
اسی سے تعمیر دنیا بھی ۳۱۹

موت کے عقیدہ نے زندگی دے دی ۳۲۱
قناعت ۳۲۲
زندہ رہنمائی ۳۴۲
کہاں سے کہاں تک ۳۲۶
خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد ۳۳۲
دوسرے کا اعتراف ۳۳۳
کرنے کا کام ۳۳۴
صابرانہ طریقہ ۳۳۵
غریبی کا سبب ۳۳۶
ایک تقابل ۳۳۷
مسجد کو دیکھ کر ۳۳۸
تبرکات ۳۳۹
ہر آدمی کے لئے سب سے پہلا کام ۳۴۰
جاحظ اور حریری ۳۴۱
ایک عبرت انگیز واقعہ ۳۴۲
تقریر و خطابت کے کمالات ۳۴۳
شاعر کا اعتراف ۳۴۵
بناوٹی قصے ۳۴۶
ہماری زندگی کا ایک دردناک پہلو ۳۴۸
العراق اول قطر ۳۵۰
عربی زبان نئی اہمیت ۳۵۲
ہم نے اپنی عمر ضائع کردی ۳۵۷
نصف صدی بعد ۳۶۰
جب بادشاہ بھی ۳۶۴
جب خدا کی زمین ۳۶۵
دین داری یہ ہے ۳۶۶

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں حال کی انسانی نسلیں
اپنے ماضی کا مشاہدہ کر سکتی ہیں

پہلا باب

جماعت صحابہ

صحیح مسلم (کتاب الجہاد والسیر) میں یہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بیان کیا کہ جب بدر کا دن تھا۔ اور دونوں گروہ ایک میدان میں آمنے سامنے جمع تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار مسلّح افراد تھے۔ اور دوسری طرف آپ کے اصحاب صرف ۳۱۳ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ، تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما —— اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کی اس جماعت کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی :

اللّٰھمَّ اِن تُہلِك ھٰذہِ العِصابۃَ من اھل الاسلام لا تُعبَد
(بعد ھا) فی الارض (صحیح مسلم بشرح النووی ۸۴/۱۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بلا مبالغہ درست تھے۔ آپ کے یہ اصحاب جن کو حالات نے میدان بدر میں اکٹھا کیا تھا، وہ خیار انسانیت تھے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام (تمہارے جو افراد جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہوں گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرب میں جو لوگ اکٹھا ہوئے تھے، وہ پوری بشری تاریخ کے بہترین لوگ تھے، وہ لمبے تاریخی عمل کے دوران بن کر تیار ہوئے اور پھر انھیں یہ موقع ملا کہ وہ خاتم الرسل کا ساتھ دے کر وہ انقلاب برپا کریں جو ہزاروں سال سے اللہ تعالےٰ کو مطلوب تھا۔ مگر اب تک وہ وقوع میں نہیں آیا تھا۔

یہ وہ قیمتی گروہ تھا جو تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھا۔ وہ ایک طرف خیار انسانیت تھا اور دوسری طرف خیار اسلام۔

برتر تدبیر

حضرت ابراھیم بن عیلہ کو خلیفہ ہشام بن عبد الملک اموی نے بلایا اور ان کو مصر کے محکمۂ خراج کے افسر کا عہدہ پیش کیا۔ حضرت ابراھیم بن عیلہ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

خلیفہ ہشام کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا ورنہ آپ کو سخت سزا دی جائے گی۔ حضرت ابراھیم بن عیلہ نے نہایت نرمی کے ساتھ کہا: "اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کو امانت پیش کی مگر انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر جب خدائے بزرگ و برتر ذمہ داری قبول نہ کرنے پر خفا نہیں ہوئے تو آپ کیوں مجھ پر خفا ہو رہے ہیں۔" خلیفہ ہشام بن عبد الملک یہ سن کر چپ ہو گیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ابراھیم بن عیلہ کے مذکورہ جواب سے پہلے خلیفہ ہشام کو غلطی ابراھیم بن عیلہ کی طرف نظر آ رہی تھی، اس جواب کے بعد خلیفہ کو محسوس ہوا کہ غلطی خود اس کی اپنی طرف ہے۔ اس احساس نے اس کی سوچ کو بدل دیا اور اس نے اپنے متشددانہ حکم کو واپس لے لیا۔

یہ ایک عظیم الشان فطری ہتھیار ہے جو اللہ تعالےٰ نے ہر آدمی کے لیے اور ہر آدمی کے خلاف مہیا کیا ہے، خواہ اس کا حریف بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

آدمی اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ وہ تیز و تند الفاظ بول کر یا مخالفانہ کارروائی کر کے معاملہ کو مزید نہ بگاڑے تو یقینی طور پر وہ اس امکان کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب بھی اپنے خلاف کوئی صورت حال پیش آئے، وہ ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر کارروائی کرے۔ وہ فریق ثانی کے اندر احساس خطا کو جگانے کی کوشش کرے۔ اگر فریق ثانی کے اندر احساس خطا بیدار ہو گیا تو گویا وہ خود ہی اپنے ہتھیاروں سے زخمی ہو گیا۔

فریق ثانی کے اندر چھپی ہوئی فطرت کو جگانا اس کے اوپر سب سے بڑا حملہ ہے۔ کوئی بھی شخص نہیں جو اس حملہ کی تاب لا سکے۔ تاہم یہ حملہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی کر لیں۔ جو لوگ اشتعال کی بات پر مشتعل ہو جائیں وہ کبھی اس اعلیٰ تدبیر کو استعمال نہیں کر سکتے۔

زمانی فرق

مکی دور کا ایک واقعہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک روز وہ کعبہ میں گئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق نماز پڑھنا شروع کیا۔ مکہ کے مشرکین نے ان کو کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ دوڑ کر آئے اور ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے ان کو بری طرح مارا پیٹا حتی کہ یہ ممکن نہ رہا کہ وہ وہاں اپنی نماز کو پورا کر سکیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کو یہاں میں بلاتقابل درج کر رہا ہوں۔ اس دن بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس کو سوادھیائے تحریک والوں نے منظم کیا تھا۔ چوپاٹی کے میدان میں تقریباً دس لاکھ ہندو حضرات اکٹھا تھے۔ ایک سرے پر بہت اونچا اور بہت وسیع منچ بنایا گیا تھا جس پر مسٹر ایل کے ایڈوانی اور دوسرے بہت سے بڑے بڑے ہندو لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی مقرر کے طور پر وہاں مدعو تھا۔

اس دوران مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے منچ کے ایک طرف کھڑے ہو کر سب کے سامنے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت سوادھیائے تحریک کے چیرمین دادا جی پانڈورنگ شاستری کی تقریر ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر روکی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ دور اول کے واقعہ میں غیر مسلموں نے ایک مسلمان کو نماز پڑھنے نہیں دیا تھا۔ آج خود غیر مسلموں کے بڑے مجمع میں ایک مسلمان آزادی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔ اس فرق کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ اور موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر آج مذہب کے حق میں ایسے امکانات کھل گئے ہیں جو کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔

پہلے تشدد کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ آج امن کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آزادانہ طور پر مذہبی سرگرمیاں جاری نہیں کی جا سکتی تھیں، آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کامل آزادی کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کو جاری کیا جائے۔

دو نمونے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کے سامنے بھی اسلام کو پیش کیا اس نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ تردد کا اظہار کیا۔ مگر ابو بکر کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے سامنے جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کسی شبہ یا تردد کا اظہار نہیں کیا بلکہ فوراً ہی اسلام قبول کر لیا (حیاۃ الصحابہ ۶۸/۱) حضرت ابو بکر اپنی اسی صفت کی بنا پر الصدیق کہے گئے۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں ایک نمونہ حضرت ابو بکر صدیق کا ہے۔ دوسرا نمونہ وہ ہے جو حضرت عمر فاروق کی زندگی میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر نے پہلے اسلام کی سخت مخالفت کی اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ انھوں نے قرآن کے کچھ حصہ کو پڑھا اور اس پر غور کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے رویہ کو بدلنے کا فیصلہ کیا اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

یہ دو علامتی نمونے ہیں۔ یہ دونوں رہنما نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق کے معاملہ میں انسان کو ان دو میں سے کسی ایک کی مانند ہونا چاہیے۔ ان دو کے بعد کوئی تیسرا نمونہ مطلوب نمونہ نہیں۔

پہلے نمونہ کے مطابق، آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ گہرے غور و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو اتنا پختہ بنائے کہ وہ خود ہی حقیقت کو اس کی گہرائی تک سمجھ جائے۔ وہ فکری اعتبار سے خود یہ اہلیت رکھتا ہو کہ شکوک و شبہات کے پردے کو پھاڑ سکے اور غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھ لے۔ یہ فکری پختگی کا اعلیٰ درجہ ہے اور حضرت ابو بکر صدیق اسی درجہ کی آخری تکمیلی مثال ہیں۔

دوسرے نمونہ کے مطابق، آدمی کو متعصبانہ فکر اور بے اعترافی سے آخری حد تک پاک ہونا چاہیے۔ اس کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اتنا زیادہ خالی ہونا چاہیے کہ جب بھی دلیل کی زبان میں اس کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کی جائے تو وہ فی الفور اس سے باخبر ہو جائے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ حضرت عمر فاروق اس دوسرے نمونہ کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ نے ایک ایسا فیصلہ فرمایا جو درست نہ تھا اس کے بعد کسی شخص نے دلیل کی زبان میں اس کی وضاحت کی تو آپ نے فوراً ہی اس کو مان لیا اور شدت اعتراف کے تحت آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

لولا فلان لهلك عمر۔

دو انسان

مسیلمہ کذّاب (م ۱۲ھ) نجد کے علاقہ میں یمامہ کا رہنے والا تھا۔ اس مقام کو اب جُبَیلہ کہا جاتا ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اسی لیے وہ کذاب (جھوٹا) کہا جاتا ہے۔ عربی میں مثل ہے: اکذب من مسیلمۃ۔ یعنی مسیلمہ سے بھی زیادہ جھوٹا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عَمرو بن العاص رضؓ نے یمامہ جاکر مسیلمہ سے ملاقات کی۔ مسیلمہ نے پوچھا کہ تمہارے صاحب پر حال میں اترنے والی وحی کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ آپؐ پر ایک سورہ اتری ہے جو نہایت مختصر اور نہایت بلیغ ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ عمرو بن العاص نے اس کو سورہ العصر سنائی:

والعصر۔ ان الانسان لفی خسر۔ الا الـذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

اس کو سن کر مسیلمہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا کہ میرے اوپر بھی اسی قسم کا کلام اترا ہے۔ عمرو بن العاص نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ مسیلمہ نے حسب ذیل الفاظ سنائے:

یاوبر یاوبر وانما انت اذنان وصدر وسائرك حفر ونقر۔

اس کے بعد اس نے پوچھا کہ اے عَمرو، تمہارا کیا خیال ہے۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا: خدا کی قسم، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم کو جھوٹا سمجھتا ہوں (تفسیر ابن کثیر ۴/۵۴۷) مسیلمہ کو معلوم تھا کہ اس کے یہ الفاظ بالکل لغو ہیں۔ مگر اس نے نعوذ باللہ قرآن کا مذاق اڑانے کے لیے ان کو موزوں کرکے سنایا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ یہ سورہ العصر مکہ میں نازل ہوئی تھی، جب وہ اتری تو بعض صحابہ نے اس کو ایک تختی پر لکھا اور اس کو کعبہ کی دیوار پر آویزاں کردیا۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے اس کو پڑھا۔ انھیں میں سے ایک لبید بن ربیعہ العامری (م ۴۱ھ) تھے۔ وہ بھی نجد کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں ہوتا ہے۔ بعد کو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیعت کرکے اسلام قبول کیا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام سے ان کا پہلا تاثر سورہ العصر کے ذریعہ ہوا تھا، وہ مکہ آئے اور کعبہ کی دیوار پر لکھی ہوئی مختصر سورہ العصر کو پڑھا۔ ان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ جوش میں آکر

اسی وقت کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ آخر میں انھوں نے کہا: واللہ ما ھذا من کلام البشر (خدا کی قسم، یہ کسی انسان کا کلام نہیں)

اس کے بعد وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ عرب کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ مگر انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ شاعری کیوں چھوڑی تو جواب دیا: أبعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا (ترك الشعر فلم يقل في الاسلام الّا بيتاً واحداً) الاعلام ۵/۲۴۰

ایک ہی واقعہ ایک شخص کے لیے گمراہی کا سبب بن گیا اور دوسرے آدمی کو اسی سے ہدایت مل گئی۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ اُنانیت ہے۔ مسیلمہ اپنے سینہ میں انانیت لیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کو سب سے بڑا سمجھتا تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں گم تھا، اس لیے وہ حق کو دیکھنے سے محروم رہا۔ اس نے اپنے آپ کو جانا، اور اس کی ذات کے باہر جو زیادہ بڑی حقیقت تھی اس کا ادراک کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس معاملہ لبید کا تھا۔ وہ حق کو سب سے بڑا سمجھتے تھے۔ ان کا سینہ خود پسندی سے پاک تھا۔ وہ ذاتی مصالح سے اوپر اٹھ کر حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس بنا پر جب حق آیا تو فوراً وہ اس کو پہچان گئے، اور اپنے آپ کو فوراً اس کے حوالے کر دیا۔

اس دنیا میں سب سے بڑا جرم حق کا انکار ہے، اور سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف۔ پہلی چیز آدمی کو جہنم میں لے جاتی ہے، اور دوسری چیز اس کو جنت کا مستحق بنا دیتی ہے۔

اسلام کے سفیر

ام حَرام بنت مِلحان ایک صحابیہ ہیں۔ ان کا نکاح حضرت عبادہ بن الصامت انصاری سے ہوا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ بیرونی ملکوں کا سفر کیا۔ اور اب قبرص (Cyprus) میں ان کی قبر ہے۔ ان کی قبر کو وہاں قبر المرأۃ الصالحۃ کہا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۱/۵۹۲) حضرت خالد بن الولید کی قبر حمص (شام) میں ہے، حالاں کہ وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔

یہی معاملہ بیشتر اصحاب رسول کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن آج اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ کو بہت کم صحابہ کی قبریں ملیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ ان میں اکثر کی وفات ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں ہوئی اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مدینہ کی مسجد میں جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو تم لوگ اختلاف نہ کرو۔ بلکہ تم ملکوں اور شہروں میں جاؤ اور ہر جگہ کے لوگوں تک میری طرف سے میرا پیغام پہنچا دو (فأدُّوا عنِّی) سیرت ابن ہشام ۲۷۹/۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر اصحاب کرام عرب سے نکل کر بیرونی ملکوں میں پھیل گئے۔ باہر کے ملکوں میں جا کر وہ تجارت کرتے تھے یا محنت سے اپنی روزی کماتے تھے اور لوگوں تک اس پیغام کو پہنچاتے تھے جو ان کو پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ ملا تھا اس طرح ہر شخص اسلام کا سفیر بن گیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام زمین کے چاروں طرف پھیل گیا اور تمام آباد دنیا میں اسلام کے نشانات دکھائی دینے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان معاشی اسباب کے تحت ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ اس طرح دوبارہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ہر جگہ اسلام کے سفیر کا کام انجام دے سکیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا یہ سفر صرف معاشی سفر نہ رہے گا بلکہ پورے معنوں میں دعوتی سفر بن جائے گا۔ اس طرح اسلام کی عالمی اشاعت پھر اسی طرح ہونے لگے گی جس طرح وہ دور اول میں ہوئی تھی۔

رہنما کی اہمیت

صحیح البخاری (کتاب مناقب الانصار) میں ایک طویل حدیث آئی ہے۔ خلیفہ اول ابوبکر صدیق ؓ سے ایک خاتون نے پوچھا کہ دین کا معاملہ کب تک درست رہے گا۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا: بقاؤکم علیہ ما استقامت بکم ائمتکم (فتح الباری ۷/۱۸۲) یعنی دین صحیح پر تم لوگ اس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمہارے رہنما درست رہیں۔

کوئی تحریک خواہ وہ اچھی ہو یا بری، ہمیشہ رہنما طبقہ اس کو چلاتا ہے۔ کسی قوم کا رہنما طبقہ ہی اس قوم کا ذہن ساز طبقہ (opinion-maker class) ہوتا ہے۔ وہی عوام کو کسی اشو پر موبیلائز کرتا ہے، وہی لوگوں کو ابھار کر کسی محاذ پر کھڑا کرتا ہے۔ کوئی تحریک خواہ بظاہر عوام کے نام پر اٹھی ہو، حقیقۃً وہ کچھ رہنماؤں کی اٹھائی ہوتی ہے۔

کسی معاملہ کی نوعیت کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف خواص ہیں جو اس کی واقعی نوعیت کو سمجھتے ہیں اور عوام کو رہنمائی دیتے ہیں۔ یہی رہنمائی کسی قوم کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگر رہنما نے قوم کو صحیح رخ پر اٹھایا ہو تو وہ آخرکار اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔ اور رہنما اگر قوم کو غلط رخ پر دوڑا دے تو ساری قربانیوں کے باوجود قوم تباہی کے گڑھے میں جاگرتی ہے۔ وہ پانے کے بجائے کچھ اور کھو دیتی ہے۔

کسی قوم کی عملی زندگی میں رہنما کا رول بے حد نازک ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رہنما آخری حد تک سنجیدہ ہو۔ کیوں کہ اس نے اگر قوم کو غلط سمت میں دوڑا دیا تو اس کے بعد جو تباہی آئے گی اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی رہنما پر ہوگی۔

دریا میں تیرنے کے لیے وہی آدمی اترتا ہے جو تیراکی کا فن جانتا ہو۔ اسی طرح رہنمائی کے میدان میں صرف اس شخص کو آنا چاہیے جس نے اس کی ضروری شرطوں کو پورا کیا ہو —— دین کا بخوبی علم، حالات موجودہ کا گہرا مطالعہ، قوم کی ایمانی اور اخلاقی حالت کا صحیح اندازہ، بیرونی طاقتوں کے بارہ میں کامل معلومات، اس قسم کے تمام ضروری پہلوؤں پر جس کو دستگاہ حاصل ہو اسی کو رہنمائی کے میدان میں اترنا چاہیے۔ اس کے بغیر رہنمائی کا کام سنبھالنا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔

غلط فہمی

صحیح البخاری (کتاب النکاح، باب عرض الانسان ابنته او اخته علی اهل الخیر) میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا جب ان کی صاحبزادی حفصہ بیوہ ہوگئیں جن کا نکاح خنیس بن حُذافہ السہمی سے ہوا تھا۔ اور وہ مدینہ میں وفات پا گئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر میں عثمان بن عفان کے پاس آیا اور میں نے ان کو حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ چند دن کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس وقت میں نکاح نہیں کرسکوں گا۔

حضرت عمر کہتے ہیں کہ پھر میں ابو بکر صدیق سے ملا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی حفصہ کا نکاح آپ سے کر دوں۔ ابو بکر خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا (فصمت ابوبکر فلم یرجع الیّ شیئاً)

حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابو بکر پر مجھے عثمان سے بھی زیادہ غصہ آیا (وکنت اوجدَ علیه منی علی عثمان، وفی روایة: فغضب علی ابی بکر وقال فیها، کنت اشدّ غضبا حین سکت منّی علی عثمان)

پھر میں کچھ دن تک ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ کے ساتھ میں نے حفصہ کا نکاح کر دیا۔ اس کے بعد میری ملاقات ابو بکر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ شاید تم مجھ پر غصہ ہوئے ہوگے جب کہ تم نے مجھ سے حفصہ کا پیغام دیا تھا۔ اور میں نے تم کو کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر نے کہا کہ اس معاملہ میں جواب سے مجھے صرف اس چیز نے روکا تھا کہ میں جانتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا ذکر کیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں رسول اللہ کا راز کھول دوں۔ اگر آپ ان کو چھوڑ دیتے تو میں ضرور انھیں قبول کر لیتا (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۹/۸۱ - ۸۳)

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں انتہائی جلیل القدر صحابی ہیں۔ اس کے باوجود

ایسا ہوتا ہے کہ ایک صحابی دوسرے صحابی کے رویہ کو اتنا زیادہ غلط سمجھ لیتا ہے کہ اس پر اس کو غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ یہ در اصل غلط فہمی کا معاملہ تھا نہ کہ غلط کاری کا۔

اصل یہ ہے کہ حضرت عمر ابتدائی مرحلہ میں مذکورہ واقعہ کو محض ظاہر کے اعتبار سے لے رہے تھے۔ ظاہر کے اعتبار انھیں دکھائی دیا کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان نے نامناسب رویہ اختیار کیا۔ مگر جب معاملہ کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کا رویہ بالکل درست تھا۔ اس میں غصہ ہونے کی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہ تھی۔

ایک صحابی کو جب دوسرے صحابی کے معاملہ میں غلط فہمی ہوسکتی ہے تو عام مسلمان کو دوسرے مسلمان کے معاملہ میں بھی یقیناً غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنے میں وہ انتہائی محتاط ہو۔ عین ممکن ہے کہ بعض ظاہری چیزوں کو دیکھ کر وہ بری رائے قائم کر رہا ہو۔ حالاں کہ زیادہ گہرے اسباب بتا رہے ہوں کہ یہ سراسر غلط فہمی کی بات ہے، کیونکہ وہاں سرے سے کوئی غلط فعل پایا نہیں جا رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں باہمی تعلقات میں بگاڑ کا سبب اکثر حالات میں غلط فہمی ہوتا ہے۔ حتی کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر حالات کے اعتبار سے غلط فہمی بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

یہ غلط فہمی دو مخلص افراد یا دو بے قصور گروہوں کے درمیان بھی ہوسکتی ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ جب بھی غلط فہمی کی صورت پیدا ہو تو ایسا نہ کرے کہ اس پر یقین کرکے بیٹھ جائے۔ بلکہ متعلق افراد سے مل کر اس کی تحقیق کرے۔ کامل تحقیق کے بغیر ہرگز وہ اس کو تسلیم نہ کرے۔ تحقیق کا طریقہ غلط فہمی سے پیدا ہونے والی برائیوں کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تحقیق کے بعد جب غلط فہمی بے بنیاد ثابت ہو تو فوراً اپنے دل و دماغ سے اس کو نکال دے۔ اپنے آپ کو دوبارہ اسی طرح معتدل بنا لے جس طرح وہ غلط فہمی کی صورت پیدا ہونے سے پہلے تھا۔

تحقیق کو اپنا اصول بنا لیجئے۔ اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔

زیادہ ثواب

قرآن کی سورہ النور میں ۶ھ میں پیش آنے والے اس واقعہ کا ذکر ہے جو اسلام کی تاریخ میں افک کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر مدینہ کے کچھ شرپسندوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ایک جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے نتیجہ میں پورے شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وقتی طور پر مسلمانوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے (لا تحسبوہ شراً لکم بل ھو خیر لکم) النور ۱۱

اس قسم کا فتنہ یا اس قسم کی شر انگیزی کیوں اہل ایمان کے لیے خیر ثابت ہوتی ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ایسا ہر فتنہ سچے مومن کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس اعلیٰ ایمانی عمل کا ثبوت دے جس کو قرآن میں ظن خیر کہا گیا ہے (النور ۱۲) افواہوں کی آندھی میں حسن ظن کا طریقہ اختیار کر کے وہ مزید ثواب کمائے، وہ زیادہ بڑا عمل کر کے اللہ کی نظر میں زیادہ مقبول بندہ بن جائے۔

مثلاً الزام تراشی کی اس مہم میں جو لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر شریک ہو گئے ان میں سے ایک حسان بن ثابت انصاریؓ بھی تھے۔ چنانچہ بعد کو جب متحقق ہو گیا کہ یہ پورا قصہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھا تو حسان بن ثابت کو ان کی غلطی پر کوڑے مارے گئے۔ مگر جہاں تک حضرت عائشہ کا تعلق ہے وہ کبھی حسان بن ثابتؓ سے متنفر نہیں ہوئیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اس کو سخت ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حسان کو برا کہا جائے (قال عروۃ وکانت عائشۃ تکرہ ان یُسبّ عندھا حسان) وہ حسان کے اشعار پڑھ کر کہا کرتی تھیں کہ حسان وہ ہیں جنھوں نے اسلام کی مدافعت میں ایسے اور ایسے اشعار کہے ہیں (التفسیر المظہری ۶/۲۷۳)

حضرت عائشہؓ کا یہ قول شرافت اور بلند اخلاقی کی نہایت عظیم مثال ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ ایسا ایک کلمہ آدمی کو جنت میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ مگر اس قسم کے جنتی کلام کا کریڈٹ کسی کو ٹھنڈے حالات میں نہیں مل سکتا۔ یہ تو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ اس کے خلاف شر انگیزی اور فتنہ پردازی کا طوفان کھڑا کیا جائے مگر وہ مشتعل نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ انصاف اور

خیر خواہی کی روش نہ چھوڑے۔ اس کے باوجود اس کی زبان سے دوسروں کے لیے خیر کا کلمہ نکلے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کا اعتراف کرے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کے حق میں نیک دعا کرے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح منفی ردعمل سے بچائے اور ہر حال میں تقویٰ کی مثبت روش پر قائم رہے۔

اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں جب یہ بے ہودہ خبر پھیلی تو حضرت ابوایوب انصاریؓ اپنے گھر میں آئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ اے ابوایوب، آپ نے سنا کہ عائشہؓ کے بارہ میں کیا کہا جارہا ہے۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ ہاں میں نے سنا۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ پھر انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کروگی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ ابوایوب انصاریؓ نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے افضل ہیں۔ ان کی بیوی نے جواب دیا کہ ہاں، آپ نے صحیح کہا۔ (تفسیر قرطبی ۲۰۲/۱۲)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صفوان بن المعطل السلمی کا نام لیا جن کے ساتھ ظالموں نے حضرت عائشہ صدیقہ کو ملوث کیا تھا۔ ابوایوب انصاری نے کہا کہ میں خود اپنے بارہ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت اگر میں صفوان کی جگہ پر ہوتا تو میرے دل میں اس طرح کا خیال تک نہیں آسکتا تھا۔ پھر صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے، وہ کیوں کر ایسا سوچ سکتا تھا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں قول سدید کہا گیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ کیا کہ ایک سادہ منطق کو استعمال کرکے اسے پہلے ہی مرحلہ میں رد کردیا۔ انھوں نے سوچا کہ کوئی بھی شریف انسان ایسا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ پھر کیسے مان لیا جائے کہ عائشہ صدیقہ جیسی شریف خاتون یا صفوان جیسا مخلص مومن اس قسم کی ذلیل بات کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہنگامی واقعہ اگر نہ پیش آتا تو ابوایوب انصاری کو اس عظیم عمل کا انعام کیسے ملتا کہ ذہنی بھونچال کے وقت بھی انھوں نے اعتراف کا ثبوت دیا۔ ناموافق پروپگنڈوں کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو فکری اعتدال پر باقی رکھا۔ زلزلہ خیز حالات بھی اس میں کامیاب نہیں ہوئے کہ ان کے قدم کو حق وصداقت سے ہٹادیں۔

حسن ظن ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے آدمی کو خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے حسن ظن کو خدا کی نظر میں ایک عظیم عمل بنادیا ہے۔

عوام و خواص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر قدیم مکہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک نام رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف کا ہے۔ وہ قریش کے پہلوانوں میں سے تھے۔ روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ میں کُشتی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد رکانہ نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ کشتی کیسے ہوئی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ سے کہا: أفرأيت إن صرعتك أتعلم أن ما أقول حق (اگر میں کشتی میں تم کو پچھاڑ دوں تو کیا تم جان لوگے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق ہے) البدایۃ والنھایۃ ۱۰۳/۳

دوسری روایت میں اس قول کو رکانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: إن صرعتني علمتُ أنك صادق (اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو میں جان لوں گا کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں) الکامل فی التاریخ ۷۵/۲

رکانہ کی طرح عمر بن الخطابؓ بھی قدیم مکہ کے پہلوانوں میں سے تھے۔ مگر نہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی میں پچھاڑنے کی بات کی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایسا کہا۔ اس کے برعکس عمر فاروقؓ نے قرآن کو پڑھا۔ اس کو پڑھنے سے ان پر حقیقت منکشف ہوئی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اصل یہ ہے کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک عوام اور دوسرے خواص۔ عوام وہ ہیں جو پیدائشی طور پر کم تر ذہنی سطح سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور خواص وہ ہیں جو بلند ذہنی سطح کے مالک ہوں۔ دونوں کی ذہنی ضرورتیں الگ ہیں اور دونوں کو ان کی ذہنی ضرورت یا ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام دیا جاتا ہے۔

رکانہ کا تعلق عوام کے طبقہ سے تھا۔ وہ کُشتی کی ہار جیت سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ مگر عمر فاروق خواص کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے مالک تھے۔ اور اعلیٰ ذہن کے لوگ دلائل و حقائق سے متاثر ہوتے ہیں نہ کہ مذکورہ نوعیت کی کسی چیز سے۔

عوام وخواص یا کمتر ذہنی سطح اور اعلیٰ ذہنی سطح کی یہ تقسیم خود خالق فطرت کی قائم کردہ ہے۔ یہ فطری فرق تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کی دعوت دو سطح پر چلائی جائے۔ ایک عوام کی سطح پر جہاں قصے اور مثالیں اور فضائل کی زبان میں لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے۔

دوسری سطح خواص کی ہے۔ یہاں لوگوں کو اسلام کا پیغام دلائل وحقائق کی زبان میں دینا ہوگا۔ یہاں اسلام کی تعلیمات کو اعلیٰ عقلی اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا۔ اسی لیے ایک صحابی نے کہا کہ لوگوں سے ان کے عقلی معیار کے مطابق بات کرو (کلموا الناس علی قدر عقولهم)

اس تقسیم کو توڑا نہیں جاسکتا۔ عوام کے سامنے اگر منطقی اسلوب یا دلائل کی زبان میں بات کی جائے تو وہ ان کے ذہن کو اپیل نہیں کرے گی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے عاجز رہیں گے۔ اسی طرح اگر خواص کے سامنے عوام کی زبان میں بات کہی جائے تو وہ خواص کو متاثر کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔

اسلام کے احیاء کے لیے عوام اور خواص دونوں قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر خواص دین سے دور ہوں تو صرف عوام میں دین کا پھیلنا احیاء اسلام کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر عوام میں دین نہ پھیلا ہو تو صرف خواص کا اسلام پسند بن جانا کوئی حقیقی انقلاب لانے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایسی تحریکیں جاری ہوں جو دوطرفہ تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوں۔ ایک طرف وہ عوام کے اندر عمومی دینی فضا پیدا کریں۔ دوسری طرف خواص کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرکے انھیں دین کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ دین کی گاڑی پہلے بھی انھیں دونوں پہیوں کی یکجائی سے چلی تھی اور آج بھی وہ اسی طرح چلے گی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ دین کی گاڑی کو چلانے والا نہیں۔

باشعور افراد

عبد اللہ بن اُبی قدیم مدینہ کا سب سے بڑا سردار تھا۔ حتی کہ مدینہ کے باشندے اِس پر متفق ہوگئے تھے کہ اُس کو اپنا بادشاہ بنالیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آگئے تو آپ ہی کو مدینہ کے لوگوں نے بڑا مان لیا۔ مدینہ میں ابتداءً مہاجرین اقلیت میں تھے۔ مگر مختلف مقامات سے لوگ ہجرت کرکے آتے رہے، یہاں تک کہ مدینہ میں مہاجرین کی اکثریت ہوگئی اور انصار اقلیت میں ہوگئے جن کا عبد اللہ بن ابی سردار چلا آرہا تھا (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۳۷۰)

ان باتوں کی وجہ سے عبد اللہ بن ابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین سے سخت بغض ہوگیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو اور مہاجرین کو مطعون کرتا اور انھیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں عبد اللہ بن اُبی اپنے قبیلہ کے بہت سے لوگوں کے ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک واقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے خلاف دشنام طرازی کی۔ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہم لوگ مدینہ کے عزت والے لوگ ہیں۔ اگر ہم مدینہ پہنچ جائیں تو ہم لوگ اپنے شہر سے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے (المنافقون ۸)

یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ قافلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہوا جو راوی کے الفاظ میں یہ تھا :

ان ابنہ عبد اللہ وقف لابیہ عبد اللہ بن ابی بن سلول عند مضیق المدینۃ فقال قِف فواللہ لا تدخلہا حتی یأذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک۔ فلما جاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم استأذنہ فی ذلک فأذن لہ

اس کے لڑکے عبد اللہؓ اپنے باپ عبد اللہ بن اُبی بن سلول کے لیے مدینہ کے دروازہ پر کھڑے ہوگئے۔ عبد اللہ بن اُبی وہاں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ٹھہرو، خدا کی قسم تم شہر میں داخل نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دے دیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو عبد اللہ بن اُبی نے آپ سے اجازت مانگی۔ آپ

فارسله حتی دخل المدینة نے اس کو اجازت دے دی۔ اس کے بعد عبد اللہ
(البدایہ والنہایہ ۴/ ۱۵۸) نے اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مدینہ میں داخل ہوگیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام اتنے دانش مند لوگ تھے کہ وہ بتائے بغیر باتوں کو جان لیتے تھے۔ حضرت عبد اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ انھوں نے بطور خود یہ جان لیا کہ اس موقع پر انھیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ اس وقت موزوں ترین بات یہ تھی کہ عبد اللہ بن اُبی کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ ہو جائے کہ اب مدینہ کے بڑے تم نہیں ہو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بڑے اور مدینہ کے سردار ہیں۔

حضرت عبد اللہ نے اس بات کے مظاہرہ کا انتہائی بروقت اور صحیح طریقہ اختیار کیا۔ اس کام کو کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ عبد اللہ بن ابی کا بیٹا اسے انجام دے۔ حضرت عبد اللہ نے اس حقیقت کو سمجھا اور عین وقت پر وہ مطلوبہ کردار ادا کیا جو اس موقع پر انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔

کسی مشن کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کو باشعور افراد کی ایک ٹیم مل جائے، اس طرح کی باصلاحیت ٹیم کے بغیر کوئی بھی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس ٹیم کے افراد میں دو صفت لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد اطاعت گزار ہو۔ اس سے جو کچھ کہا جائے وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کرے۔ وہ کسی عذر کو عذر نہ بنائے، خواہ وہ ذاتی عذر ہو یا خارجی عذر۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس ٹیم کے افراد اتنے باشعور ہوں کہ وہ کہے بغیر باتوں کو جان لیں۔ وہ بتائے بغیر صورت حال کو سمجھ لیں۔

اس دوسری صفت کی اہمیت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں بہت سی باتیں بتائی نہیں جا سکتیں۔ جب مشن پھیلتا ہے اور نئے نئے تقاضے سامنے آتے ہیں تو یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ لوگوں کو ساری ضروری باتیں بتا دی جائیں۔ ایسے وقت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی عقل سے باتوں کی گہرائی کو سمجھے، وہ خود ہر موقع پر اس کے موافق ضروری اقدام کر سکے۔

کوئی بھی دوسری چیز اس شعوری پختگی کا بدل نہیں بن سکتی۔

اتحاد کی شرط

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اجتماعیت ٹوٹ گئی اور لوگوں میں کثرت سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت ایک شخص نے حضرت علی سے پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا معاملہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں لوگ اختلافات میں پڑ گئے ہیں، جب کہ ابو بکر و عمر کے زمانہ میں یہ اختلافات نہ تھے۔ حضرت علی نے جواب دیا: لان ابابکرٍ وعمرَ کانا والیینِ علی مثلی و انا الیوم والٍ علی مثلک (یعنی اس کا سبب یہ ہے کہ ابو بکر و عمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں تھے، اور میں تمہارے جیسے لوگوں کے اوپر حکمراں ہوں۔

ابن خلدون نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دینی حکومت کے قیام کے لئے اس کے مطابق دینی رجحان (الوازع الدینی) کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر معاشرہ کی سطح پر غالب دینی رجحان موجود نہ ہو تو محض حاکم کے اسلامی ہونے سے کامیاب اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ حضرت علی کے اس جواب میں آپ کا اشارہ اسی دینی محرک اور رجحان کی طرف تھا۔ المامون کو دیکھو۔ جب اس نے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادق کو اپنا ولی عہد نامزد کیا اور ان کو الرضا کا لقب دیا تو کس طرح عباسیوں نے اس پر شدید ناگواری ظاہر کی۔ انھوں نے ان کی بیعت کو توڑ کر المامون کے چچا ابراہیم بن المہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور اس کے ردعمل میں ایسا اختلاف پیدا ہوا اور بغاوت پر آمادہ شورش پسند گروہوں کی ایسی کثرت ہو گئی کہ قریب تھا کہ پورا حکومتی نظام کالعدم ہو جائے۔ یہاں تک کہ المامون پیش قدمی کر کے خراسان سے بغداد پہنچا اور علی الرضا کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے اپنے خاندانی شخص کو ولی عہد نامزد کیا۔

ابن خلدون نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ خلفاء راشدین ایسے زمانہ میں تھے جب کہ ملوکیت کا مزاج ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور معاشرہ پر دینی محرک اور رجحان کا غلبہ تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے اندرونی محرک کے تحت صرف ایسے ہی فرد کو خلافت کی ذمہ داری سونپی جو دینی اعتبار سے قابل قبول تھا اور اس کو دوسرے کے اوپر ترجیح دی۔ اس کے علاوہ

دوسرے افراد جن کی نگاہیں خلافت کی طرف اٹھ رہی تھیں انھیں ان کے اپنے رجحان اور محرک کے حوالہ کر دیا۔

تاہم اس کے بعد حضرت معاویہ کے زمانہ سے عصبیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اقتدار پر اسی مزاج کا تسلط ہو گیا۔ دینی رجحان کمزور پڑ گیا۔ اس کی جگہ ملوکیت اور گروہی رجحان کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا۔ چنانچہ اگر ایسے شخص کو اقتدار سونپا جائے جو گروہی عصبیت کے اعتبار سے ناقابل قبول ہو تو اس کو رد کر دیا جاتا، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حکومت انتشار کا شکار ہو جاتی اور جماعت میں اختلاف پڑ جاتا۔ جیسا کہ بعد کے زمانہ میں پیش آیا۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۲۱۱)

دور اول کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ملت میں اتحاد کس طرح آتا ہے، اور کن اسباب سے وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ ہے، ابن خلدون کے الفاظ میں، وازع دینی کا ہونا یا نہ ہونا۔ گویا اتحاد کبھی اتحاد کی اپیلیں کرنے سے نہیں آتا، بلکہ اس وقت آتا ہے جب کہ پورے معاشرہ میں اس کے موافق غالب دینی رجحان موجود ہو۔

اتحاد ملت کا کام دراصل اصلاح ملت سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معاشرہ میں دینی فضا پیدا کی جائے۔ لوگوں کو اس اعتبار سے باشعور بنایا جائے کہ تمھیں آخرت میں اپنے قول و عمل کا حساب اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔ لوگوں میں گہری آخرت پسندی پیدا کی جائے تاکہ وہ آخرت کے فائدے کے لئے دنیوی نقصان کو برداشت کر سکیں۔ لوگوں کو اسلام کے بارہ میں اس حد تک ایجوکیٹ کیا جائے کہ جب خدا اور رسول کا حکم سامنے آجائے تو وہ اپنی گردن جھکا دیں، خواہ وہ ان کے ذوق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں یہ مزاج ہو کہ اللہ کی خاطر وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو جائیں۔

کسی گروہ میں اتحاد پیدا ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اتحاد ہمیشہ زیر اتحاد افراد کی قربانیوں سے قائم ہوتا ہے۔ رائے کی قربانی، مفادات کی قربانی، اپنے کو پیچھے کر لینے کی قربانی، اپنے اختلاف کو ختم کرنے کی قربانی۔ الفاظ رکھتے ہوئے چپ ہو جانے کی قربانی۔ اس لئے پہلے ذہن بنایا جاتا ہے، اس کے بعد اتحاد قائم ہوتا ہے۔

مقام کیسے ملا

حمزہ بن عبد المطلب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ ان کے متعلق اسلامی تاریخ میں لکھا گیا کہ حمزہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے ذریعہ اللہ نے دین کو طاقت دی (کان حمزۃ ممن اعز اللہ بہ الدین)، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، المجلد الاول، صفحہ ۴۴۶) حضرت حمزہ کو یہ مقام بلا سبب نہیں مل گیا۔ بلکہ وہ ان کے حقیقی عمل کے نتیجہ میں انھیں حاصل ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حکم ہوا کہ اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو آگاہ کرو (الشعراء ۲۱۴) تو آپ نے خصوصی طور پر حمزہ کے سامنے دین توحید کو پیش کیا۔ مگر ان کے ذہن پر باپ دادا کے دین کا اتنا غلبہ تھا کہ ابتداء میں کئی سال تک اسلام کی صداقت ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ آخر کار نبوت کے چھٹے سال انھوں نے اسلام قبول کیا۔

ایک روز وہ شکار کھیل کر واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ عین اس وقت ایک عورت نے آکر ان سے کہا کہ ابھی میں نے صفا پہاڑی کے پاس محمد کو دیکھا ہے۔ وہاں عمرو بن ہشام (ابوجہل) بھی تھا اور وہ تمہارے بھتیجے کو گالی دے رہا تھا اور بہت زیادہ برا کہہ رہا تھا۔ حمزہ خاندانی غیرت کے تحت گھر سے نکلے۔ کعبہ میں انھوں نے ابوجہل کو پالیا۔ وہ ابھی تک غصہ میں تھے۔ انھوں نے لوہے کی کمان ابوجہل کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون نکل آیا۔ انھوں نے ابوجہل سے کہا کہ تم میرے بھتیجے کے دشمن بنے ہوئے ہو، تو سن لو کہ میرا دین بھی وہی ہے جو محمد کا دین ہے (دینی دین محمد)

ابوجہل کا تعلق قبیلہ بنو مخزوم سے تھا اور حمزہ کا تعلق قبیلہ بنو ہاشم سے۔

گھر واپس آئے تو قوم کے کچھ لوگ ان سے ملے۔ انھوں نے حمزہ کو شرم دلائی کہ تم صابی (بددین) ہوگئے۔ تم نے اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دیا۔ ایک بھتیجے کی خاطر تم قوم کے تمام اکابر سے کٹ گئے وغیرہ۔ اس طرح کی باتوں سے حمزہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ انھیں شبہ ہونے لگا کہ شاید میں نے خاندانی حمایت کے جوش میں آکر غلطی کر دی ہے۔ وہ رات بھر بے چین رہے۔ انھیں ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوئی تو اسی بے چینی کے عالم میں خانہ کعبہ میں گئے۔ وہاں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے پورے تضرع اور انابت کے ساتھ دعا کی:

ما صنعتُ اللّٰهمّ اِن كانَ رُشداً فاجعلْ تصديقه في قلبي وَ اِلّا فاجعل لِي ممّا وقعتُ فيه مَخرجاً

(صفحہ ۴۴۶)

میں نے جو کچھ کیا، اے اللہ اگر وہ ہدایت ہے تو اس کی تصدیق میرے دل میں ڈال دے۔ ورنہ میں جس میں پڑگیا ہوں اس سے میرے لئے نکلنے کی صورت پیدا فرما۔

اسی کے ساتھ اگلے دن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں ایک معاملہ میں پڑگیا ہوں۔ اور اس سے نکلنے کی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی ہے۔ اس لئے آپ اس معاملہ میں مجھے بتلائیے۔ اے بھتیجے میں تم سے اس معاملہ میں سننا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے ان کو نصیحت کی۔ انھیں خوف دلایا اور ان کو اللہ کے انعام کی خوش خبری دی۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے دل میں یقین ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں۔ اے میرے بھتیجے، اپنے دین کا اعلانِ عام کرو۔ خدا کی قسم، اگر مجھے وہ سب کچھ دیا جائے جس پر آسمان نے سایہ کیا ہے، تب بھی میں اس دین کو نہیں چھوڑوں گا (صفحہ ۴۴۶)

اس کے بعد حضرت حمزہ آپ کے مکمل ساتھی بن گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ ایک دولت مند شخص تھے۔ اسلام میں آنے کے بعد ان کی دولت ختم ہوگئی۔ انھیں اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ اسلام کی خاطر انھیں اپنی قوم سے لڑائی لڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ احد کی جنگ میں وہ شہید ہوگئے۔ تاہم آخر تک وہ پوری وفاداری کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے۔

یہ وہ عظیم سعادت ہے جو حضرت حمزہ کو حاصل ہوئی۔ تاہم یہ سعادت انھیں سادہ طور پر نہیں مل گئی۔ انھوں نے اپنے غیرت کے جذبات کو خدا کے دین کے لئے استعمال کیا۔ جب شیطان نے ان کے اندر شبہہ ڈالا تو انھوں نے اس شبہ کو قبول نہیں کرلیا، بلکہ اس کے لئے گریۂ وزاری کے ساتھ دعائیں کیں۔ رسول اللہؐ سے مل کر اس کی وضاحت معلوم کی۔ اور جب بات واضح ہوگئی تو پھر کوئی چیز ان کے لئے اعتراف میں مانع نہیں ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا بلکہ ہر نقصان اور مصیبت کو برداشت کرتے ہوئے برابر اس پر قائم رہے۔

یہ ہے حضرت حمزہ کی وہ قربانی جس کے نتیجہ میں ساری دنیا کے مسلمان ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں "سید الشہداء حمزہ" کہہ کر ان کی دینی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

جواں مردی یا مردانگی سے عربوں کی کیا مراد ہوتی تھی، اس کو قدیم عربی اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے جس کو عہد جاہلی کا کلام کہا جاتا ہے۔ اس جاہلی کلام کا ایک منتخب مجموعہ وہ ہے جو "الحماسة" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہم حماسہ سے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔

اذا هَمَّ همًّا لم یر اللیل غُمَّةً   علیه ولم تصعب علیه المراکب
قلیل التشکی للمهمّ یصیبه   کثیر الهوی شتّی النوی والمسالك
اذا المرء لم یدنس من اللؤم عرضه   فکل رداء یرتدیه جمیل
یسرّك مظلومًا ویرضیك ظالمًا   وکلّ الذی حمّلته فهو فاعله
اذا همَّ لم تردع عزیمه همّه   ولم یأت ما یأتی من الامر هائبا
لا مترفا ان رخَی العیش ساعده   ولا اذا حل مکروه به خشعا
لا یسئلون اخاهم حین یندبهم   فی النائبات علی ما قال برهانا
فذالك قریع الدهر ما عاش حوّل   اذا سُدّ منه منخر جاش منخر

ترجمہ

جب وہ کسی بات کا ارادہ کرلیتا ہے تو رات اس کو غم گین نہیں کرتی اور نہ سواری پر چلنا اس کے لیے مشکل ہوتا۔
سخت معاملہ پیش آنے پر وہ شکایت نہیں کرتا۔ وہ بہت باحوصلہ ہے۔ اور بہت منزلوں اور بہت راستوں والا ہے۔
جب آدمی کی آبرو ملامت زدہ بات سے گندی نہ ہوئی ہو تو وہ جو چادر بھی اوڑھے وہ اس کے لیے اچھی ہے۔
وہ تم کو مظلومی میں خوش کردے گا اور تم ظالم ہو تو تم کو راضی کرے گا۔ اور تم جو ذمہ داری بھی اس پر ڈالو اس کو وہ ضرور کرے گا۔
جب وہ ارادہ کرلے تو اس کے پختہ ارادہ سے اس کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔ اور آنے والی چیزوں میں سے کوئی چیز اس کو خوف زدہ نہیں کرتی۔
اگر اس کو زندگی کی آسودگی ملے تو وہ عیش پرست نہیں بنتا، اور اگر اس کو تنگی پیش آجائے تو وہ پست ہمت نہیں ہوتا۔
ان کا بھائی کسی مصیبت پر ان کو پکارے تو وہ اس سے دلیل نہیں پوچھتے بلکہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں۔
یہی انتخاب زمانہ شخص ہے، وہ جب تک جیتا ہے متحرک رہتا ہے، اس پر ایک راستہ بند ہوتا ہے تو وہ دوسرے راستہ میں چل پڑتا ہے۔

انقلابی فیصلہ

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب قرآن جمع کیا گیا تو آپ نے حکم دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی لکھا ہوا حصہ ہو، وہ اس کو لے آئے۔ چنانچہ ایک بڑا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت زید بن ثابت انصاریؓ نے دوسرے حافظوں کی مدد سے قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں تحریر کیا۔

زید بن ثابتؓ کا یہ مصحف قریش کے لہجہ پر تھا، جب کہ جمع شدہ ٹکڑوں میں کوئی ٹکڑا قریش کے لہجہ پر تھا اور کوئی دوسرے قبائل کے لہجہ پر۔ مذکورہ قرآن جب مرتب ہو گیا تو صحابہ کی متفقہ رائے کے مطابق، تمام بچے ہوئے ٹکڑے جلا دیئے گیے۔ یہی واقعہ دوبارہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا جب کہ مصحف صدیقی کے مطابق نسخے تیار کیے گیے، اور بقیہ لوگوں کے بطور خود لکھے ہوئے تمام مصحف صحابہ کی رائے سے جلا کر ختم کر دیے گیے۔

وہ لوگ جو کبھی پتھروں کے تقدس کے قائل تھے، ان کے لیے کلامِ الٰہی کی تختیوں کو نذرِ آتش کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم الشان انقلابی فیصلہ تھا جو حقائق کے اعلیٰ شعور کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب رسول جو مختلف عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے، فطری طور پر انھوں نے اپنے اپنے لہجہ پر قرآن کی آیتیں لکھ رکھی تھیں۔ اگر ان کے لکھے ہوئے یہ مختلف اوراق اور ٹکڑے جلائے نہ جاتے تو بعد کو ہر ٹکڑا ایک مستقل فتنہ بن جاتا۔ کیوں کہ ہر ٹکڑا اور ہر ورق کسی صحابی کی طرف منسوب ہو کر مقدس بن جاتا۔ اس کے بعد قرآن کے متن کے بارہ میں اتنا اختلاف پیدا ہوتا کہ نہ قرآن محفوظ رہتا اور نہ امّت مسلمہ۔

ان ٹکڑوں کو اگر زمین میں گاڑ دیا جاتا یا دریا میں ڈال دیا جاتا تب بھی لوگ کسی نہ کسی طرح ان کو حاصل کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلانے کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر ان کو ختم کرنے کی نہ تھی۔

اس انقلابی فیصلہ تک پہونچنے کے لیے وہ برتر فکر درکار تھی جو جذباتی احترام سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے تقاضوں کو دیکھ لیتی ہے۔ اصحاب رسول کو ان کے ایمان نے یہی انقلابی فکر عطا کی تھی۔ اور یہی انقلابی فکر ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ کے مقام پر کھڑا کرتی ہے۔

یہ حاملینِ اسلام

صلح حدیبیہ کا واقعہ سنہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسی سال کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ انھیں میں سے ایک خط وہ تھا جو دحیہ کلبی کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل (Heraclius کے نام بھیجا گیا۔ یہ مسیحی تھا اور نہایت ذہین اور حقیقت پسند آدمی تھا۔

ہرقل اس وقت فلسطین میں تھا۔ اس زمانہ میں عرب کے لوگ تجارت کی غرض سے اس علاقہ میں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہرقل نے تحقیق حال کے لیے کچھ عربوں کو بلوایا جن میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ہرقل نے ترجمان کے ذریعہ ان سے گفتگو کی۔ ایک روایت کے مطابق، گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال اخبرنی یا اباسفیان۔ فقال هو ساحر کذاب ولیس بنبی۔ فقال هرقل انی لا اُرید شتمه ولکن کیف نسبه فیکم --- کیف عقله ورأیه

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۳)

ہرقل نے کہا کہ اے ابوسفیان مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کہ وہ جادوگر اور جھوٹے ہیں، وہ پیغمبر نہیں۔ ہرقل نے کہا میں تم سے ان کی سب وشتم سننا نہیں چاہتا۔ بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا حسب ونسب کیا ہے، ان کی سمجھ کیسی ہے اور ان کی رائے کیسی ہے۔

ہرقل ایک "کافر" تھا۔ وہ کافر ہی رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اس کو اِس سے دل چسپی نہیں تھی کہ کوئی شخص اس کے حریف کے بارہ میں برے الفاظ بولے اور وہ اس کو سن کر خوش ہو۔ بلکہ اس کی دل چسپی اس میں تھی کہ وہ جانے کہ جو شخص اس کا حریف بن کر ابھرا ہے، وہ خاندانی شرافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کیسا ہے، وہ صاحب رائے ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ حاملین اسلام کو دیکھئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کے خلاف کوئی بھی لغوبات سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی کمینہ آدمی اگر ان کے مفروضہ حریف کے خلاف جھوٹے مضامین شائع کرے تو اس کو روکنا تو درکنار، وہ اس کو لطف لے کر پڑھیں گے اور ان کے معتقدین اس کو ہر طرف پھیلائیں گے ——— کیسے عجیب ہیں وہ حاملینِ اسلام جو حاملین کفر کے اخلاقی معیار پر بھی پورے نہ اتریں۔

خوف خدا

عمر بن عبد العزیز بن مروان بن الحکم الاموی (۱۰۱-۶۱ ھ) کا درجہ اسلام میں اتنا بڑا ہے کہ ان کو پانچویں خلیفہ راشد (خامس الخلفاء الراشدین) کہا جاتا ہے۔ ان کی مدت خلافت ڈھائی سال ہے۔ ان کے حالات پر کئی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

ابن الجوزی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد اللہ بن الحکیم	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد الرؤف المناوی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
احمد زکی صفوت	عمر بن عبد العزیز
عبد العزیز سید الاہل	الخلیفۃ الزاہد

اموی خلفاء میں وہ واحد خلیفہ ہیں جن کا اعتراف ان کے بعد عباسیوں نے کیا۔ شیعہ حضرات کے درمیان بھی ان کا احترام پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی ان کا غیر معمولی اعتراف کیا گیا۔ محمد بن معبد کہتے ہیں کہ میں شاہ روم کے یہاں گیا تو اس کو مغموم حالت میں زمین پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے کہا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ کتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حادثہ۔ اس نے کہا کہ مرد صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون۔ شاہ روم نے کہا کہ عمر بن عبد العزیز۔ میرا خیال ہے کہ عیسٰی بن مریم کے بعد اگر کوئی شخص مردہ کو زندہ کرنے والا ہوتا تو یقیناً وہ عمر بن عبد العزیز ہوتے۔ ایک مسیحی راہب کو لوگوں نے روتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ زمین پر ایک نور تھا، مگر اب وہ نور نہیں رہا

عمر بن عبد العزیز کی موت کے بعد کچھ لوگ ان کی اہلیہ کے پاس گئے اور کہا کہ ان کی کوئی خاص بات بتائیے۔ اہلیہ نے کہا کہ خدا کی قسم، عمر نماز اور روزہ میں تم سے زیادہ نہ تھے۔ مگر خدا کی قسم، میں نے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا جو عمر سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو (واللہ ماکان عمر باکثرکم صلاۃ ولا صیاماً ولکنی واللہ مارأیت عبداً للہ قط کان اشد خوفاً للہ من عمر)

قدردانی

قرآن کی سورہ محمد (آیت ۲۴) میں کہا گیا ہے کہ کیا یہ منافقین قرآن پر تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں تفسیروں میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

عَنْ هشام بن عُروة عَنْ اَبِیْهِ، قَالَ تَلاَ رَسُوْلُ اللّٰه صلیٰ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسلّم یَوْمًا (اَفَلاَ یَتَدَبّرُوْنَ القُرآن اَمْ علیٰ قلوب اقفالها) فَقَالَ شَابٌّ مِنْ اَهْلِ الیَمَن بَلْ عَلَیْهَا اقفالها حتیٰ یکُوْن اللّٰه تَعَالیٰ یفتحها اَوْ یفرجها۔ فَمَازَالَ الشَّاب فِیْ نَفْسِ عُمَر حتیٰ وَلِیَ فَاسْتَعَانَ بِهٖ

(تفسیر ابن کثیر ۴/۱۸۰)

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز یہ آیت تلاوت فرمائی (کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے ہیں) یہ سن کر یمن کے ایک نوجوان نے کہا ہاں، ان کے دلوں پر تالے ہیں، یہاں تک کہ خدا ہی ان تالوں کو کھول دے۔ اس نوجوان کی یاد برابر حضرت عمرؓ کے دل میں رہی یہاں تک کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس سے حکومت کے کام میں مدد لی۔

اسی صفت کا نام قدردانی ہے۔ کسی قوم یا کسی حکومت کا نظام اچھا رہنے کی ایک ضمانت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار لوگ افراد کی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ان کی قدردانی کریں، وہ ایسے افراد کو ان کی صلاحیت کی نسبت سے کام کے مواقع فراہم کریں۔ ایسے کسی فرد کو وہ جہاں پائیں اس کو اس طرح اٹھالیں جس طرح ایک جوہری راکھ میں پڑے ہوئے سونے کے ٹکڑے کو اٹھالیتا ہے۔

اس کے برعکس جب ذمہ دار لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ افراد کو اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ میرا رشتہ دار ہے یا اجنبی ہے۔ وہ میری تعریف کرتا ہے یا میرا ناقد ہے۔ وہ میرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا میرے گروہ سے باہر کا آدمی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے رکھتا ہے یا کسی معاملہ میں اس کی رائے مجھ سے مختلف ہے۔

کسی قوم یا کسی حکومتی نظام میں اول الذکر صفت والے اشخاص کا اختیار کے مناصب پر ہونا اس قوم یا حکومت کی ترقی کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس قوم یا حکومتی نظام میں ثانی الذکر صفت والے اشخاص اختیار کے مناصب پر قابض ہو جائیں، اس کو کوئی چیز تباہی اور بربادی سے بچانے والی نہیں۔

یہود کے نقش قدم پر

حضرت سلیمان بن داؤد (۹۳۰ - ۹۹۰ ق م) کا زمانہ یہود کی تاریخ میں سب سے زیادہ باعظمت زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں فلسطین اور اطراف کے علاقوں میں ان کی مضبوط اور شاندار سلطنت قائم تھی۔ حضرت سلیمان کے بعد یہودیوں میں دینی اور اخلاقی زوال شروع ہوا۔ وہ خدا سے بے خوف ہو کر سطحی اعمال میں مبتلا ہو گئے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

اس زمانہ میں یہود کے مصلحین اور انبیاء نے ان کو زبردست تنبیہات کیں جو آج بھی کثرت سے بائبل میں موجود ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ایک جز نقل کیا جاتا ہے:

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں ان پر تلوار اور کال اور وبا بھیجوں گا اور ان کو خراب انجیروں کی مانند بناؤں گا جو ایسے خراب ہیں کہ کھانے کے قابل نہیں۔ اور میں تلوار اور کال اور وبا سے ان کا پیچھا کروں گا اور میں ان کو زمین کی سب سلطنتوں کے حوالے کروں گا کہ دھکے کھاتے پھریں اور ستائے جائیں اور سب قوموں کے درمیان جن میں میں نے ان کو ہانک دیا ہے لعنت اور حیرت اور سسکار اور ملامت کا باعث ہوں۔ اس لئے کہ انھوں نے میری باتیں نہیں سنیں۔ خداوند فرماتا ہے کہ جب میں نے اپنے خدمت گزار نبیوں کو ان کے پاس بھیجا، ہاں میں نے ان کو بروقت بھیجا، پر تم نے نہ سنا (یرمیاہ ۲۹ : ۱۸)

اس بگاڑ اور اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سلطنت ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک، یہودیہ جو جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقہ میں تھی، اس کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ دوسرے، اسرائیل جو شمالی فلسطین اور شرق اردن کے علاقہ میں قائم ہوئی، اس کا پایہ تخت سامریہ قرار پایا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی قائم کی ہوئی عظیم ریاست ٹکڑے ٹکڑے ہو کر صرف دو کمزور حکومتوں کی صورت میں باقی رہ گئی۔

یہودیوں کے اخلاقی زوال اور باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اطراف کی سلطنتوں نے ان پر حملے شروع کر دئے۔ ۱۲۷ ق م میں اشور (Assyrian) کے حکمراں سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بنوکد نضر (Nebuchadnezzar) نے یروشلم کو مسخر کر کے سلطنت یہودیہ پر قبضہ کر لیا۔

خدا کے خاص لوگوں کے اوپر غیر قوم کا قبضہ یہود کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان کے اندر شدت سے مخالفانہ جذبات جاگ اٹھے۔ ان کے درمیان وہ قومی رہنما ابھرے جن کو بائبل میں "جھوٹے نبی" یا "جھوٹی نبوت کرنے والے لوگ" کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ دینی الفاظ بولتے تھے۔ مگر حقیقۃً جو چیز ان کی رہنما تھی وہ صرف ان کے اپنے رومانی تخیلات تھے جو اسرائیل کی عظمت رفتہ کو جلد از جلد واپس لانے کے لئے وقت کے حالات کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نبوت کی زبان میں کلام کرتے تھے مگر حقیقۃً وہ جھوٹے نبی تھے۔ بائبل کے الفاظ میں وہ خدا کے نام پر اپنی بات کہتے تھے۔ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے (یرمیاہ ۲۸: ۱۵، ۲۹: ۳۱) ان رہنماؤں کی جذباتی باتوں کے زیر اثر یہودیوں میں آزادی اور احیار نو کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ وہ بابل کی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے دوبارہ اپنی گزری ہوئی عظمت کو واپس لانے کا خواب دیکھنے لگے۔

اس موقع پر ان کے نبی حضرت یرمیاہ اٹھے اور یہودیوں سے کہا کہ تم کو دوسروں کے خلاف مہم چلانے سے پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ غیر قوم کا غلبہ تمھارے اوپر خدا کے حکم سے ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ تم خدا کے راستہ سے ہٹ گئے ہو۔ اب اپنے آپ کو خدا کی طرف واپس لا کر ہی تم اس مغلوبیت سے نجات پا سکتے ہو نہ کہ محض دنیوی قسم کی کارروائیاں کر کے۔ اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے خدا کی یہ تنبیہات بائبل کی کتاب یرمیاہ (باب ۲۷ ـ ۳۰) میں موجود ہیں۔ چند فقرے یہ ہیں:

تم اپنے (جھوٹے) نبیوں اور غیب دانوں اور خواب بینوں اور شگونیوں اور جادوگروں کی نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت گزاری نہ کرو گے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں تاکہ تم کو تمھارے ملک سے آوارہ کریں اور میں تم کو خارج کر دوں اور تم ہلاک ہو جاؤ (۲۷: ۹ — ۱۰) تم اپنی گردن شاہ بابل کے جوئے تلے رکھ کر اس کی اور اس کی قوم کی خدمت کرو اور زندہ رہو (۲۷: ۱۲) اور ان نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت نہ کرو گے کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں نے ان کو نہیں بھیجا۔ پر وہ میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ تاکہ میں تم کو خارج کر دوں اور تم ان نبیوں کے ساتھ جو تم سے نبوت کرتے ہیں ہلاک ہو جاؤ۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اپنے نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے نبوت کرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو خداوند کے گھر کے ظروف اب تھوڑی ہی دیر میں بابل سے واپس آ جائیں گے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ ان کی نہ سنو، شاہ بابل کی خدمت گزاری کرو اور زندہ رہو۔ پر اگر وہ نبی ہیں اور خداوند کا کلام ان کی امانت میں ہے تو وہ رب الافواج

سے شفاعت کریں تاکہ وہ ظروف جو خداوند کے گھر میں اور شاہ یہوداہ کے گھر میں اور یروشلم میں باقی ہیں بابل کو نہ جائیں (۲۷: ۱۸-۱۴) رب الافواج اسرائیل کا خدا ان سب اسیروں سے جن کو میں نے یروشلم سے اسیر کرواکر بابل بھیجا ہے یوں فرماتا ہے، تم گھر بناؤ اور ان میں بسو اور باغ لگاؤ اور ان کا پھل کھاؤ۔ بیویاں کرو تاکہ تم سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں، اور اپنے بیٹوں کے لئے بیویاں لو اور اپنی بیٹیاں شوہروں کو دو تاکہ ان سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں اور تم وہاں پھلو پھولو اور کم نہ ہو۔ اور اس شہر کی خیر مناؤ جس میں میں نے تم کو اسیر کرواکر بھیجا ہے اور اس کے لئے خداوند سے دعا کرو۔ کیونکہ اس کی سلامتی میں تمھاری سلامتی ہو گی۔ کیونکہ رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ وہ نبی جو تمھارے درمیان ہیں اور تمھارے غیب داں تم کو گمراہ نہ کریں اور اپنے خواب بینوں کو جو تمھارے ہی کہنے سے خواب دیکھتے ہیں نہ مانو۔ کیونکہ وہ میرا نام لے کر تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو نہیں بھیجا (۲۹: ۹-۵)

حضرت یرمیاہ کی ان باتوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہود غیر قوموں کی غلامی پر ہمیشہ کے لئے راضی ہو جائیں۔ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ تم اپنی موجودہ کمزوریوں کے ساتھ حکومت کے خلاف تحریکیں چلا کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تمھاری جن کمزوریوں نے غیر قوم کو تمھارے اوپر غلبہ دیا ہے ان کو ختم کئے بغیر کس طرح یہ ممکن ہے کہ تم دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن حاصل کر لو۔ اس لئے ان کا کہنا تھا کہ تم بغاوت کی مہم چلانے سے پہلے اصلاح کی مہم چلاؤ۔ چنانچہ انھوں نے "شاہ بابل کا جوا" قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہود کو یہ بشارت بھی دی کہ اگر تم خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلو تو رب الافواج فرماتا ہے کہ میں اس کا جوا تیری گردن پر سے توڑ دوں گا اور تیرے بندھنوں کو کھول ڈالوں گا اور بیگانے پھر تجھ سے خدمت نہ کرائیں گے۔ اس لئے اے اسرائیل گھبرا نہ جا کیونکہ دیکھ میں تیری اولاد کو اسیری کی سرزمین سے چھڑاؤں گا اور یعقوب واپس آئے گا اور کوئی اسے نہ ڈرائے گا (۳۰: ۹-۸)

مگر یہود نے اپنے نبی کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ ان جھوٹے رہنماؤں کی باتیں سنتے رہے جو ان کو الفاظ کی جذباتی شراب پلا رہے تھے۔ جو ان کو معمولی عمل سے بڑے بڑے نتائج کی فرضی امیدیں دلاتے تھے۔ جو نفرت اور ٹکراؤ جیسی فتنہ انگیز باتیں کرتے تھے (یرمیاہ ۲۸: ۱۶) اس حماقت (۲۹: ۲۳) کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ بابل بنوکدنضر ان کے اوپر غضب ناک ہوا اور ۵۸۷ ق م میں دوبارہ ان کے اوپر شدید تر حملہ کیا۔ اس کے بعد اس نے یہودیہ کی تمام آبادیوں کو ویران کر کے رکھ دیا۔ بے شمار یہودیوں کو قتل کیا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح برباد کیا کہ بائبل کے الفاظ میں اس کی ایک اینٹ بھی دوسری اینٹ کے اوپر باقی نہ رہی۔

سابق حاملین کتاب (یہود) کی یہ تاریخ موجودہ حاملین کتاب (مسلمان) پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ مسلمان پچھلے ہزار برس تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ کمزوریوں کا شکار ہوئے۔ ان کے افراد میں اعلیٰ کردار باقی نہ رہا۔ وہ محنت کے بجائے عیش کے عادی ہو گئے۔ باہمی اختلافات نے ان کو بے شمار گروہوں میں بانٹ دیا۔ علم اور تہذیب کی ترقی میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ اس قسم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم قومیں ان کے اوپر غالب آگئیں۔ مسلمانوں کی عظمت ہر جگہ پامال کر کے رکھ دی گئی۔

یہ واقعہ انیسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ بیسویں صدی عیسوی اس صورت حال کے خلاف جدوجہد کی صدی ہے۔ مگر یہاں بھی عملاً وہی ہوا جو ڈھائی ہزار سال پہلے یہود کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اب کچھ اللہ کے بندے اٹھے جنھوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ پہلے اپنے آپ کو مستحکم بناؤ۔ غالب قوتوں سے تصادم کے بغیر اصلاحی میدان میں اپنی کوششیں صرف کرو جو اب بھی تمھارے لئے کھلا ہوا ہے ۔ مگر مسلمانوں نے ایسے مصلحین کی بات بالکل نہیں سنی۔ ان کو انھوں نے بزدل، سامراج کا ایجنٹ اور انقلاب اسلام کا دشمن قرار دیا۔

دوسری طرف بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ اٹھے جو جہاد اور انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔ انھوں نے جذباتی تقریریں کیں۔ رومانی اشعار سنائے۔ خوبصورت نظرئے پیش کئے۔ مبالغہ آمیز قسم کی امیدیں دلائیں۔ مسلمان ایسے لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ ہر جگہ دوسری قوموں کے خلاف سیاسی ٹکراؤ اور انقلابی جہاد میں مشغول ہو گئے۔

بائبل کے الفاظ میں اس ”جھوٹی نبوت“ کا نتیجہ وہی ہوا جو یہودیوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہر محاذ پر شکست کھائی۔ ان کی بڑی بڑی تحریکیں اس طرح فنا ہو گئیں جیسے وہ ایک تنکا تھا جو ہواؤں کے طوفان میں اڑ گیا۔ ان کے مفکروں اور رہنماؤں کے بولے ہوئے شان دار الفاظ کاغذ کی کشتی ثابت ہوئے جو دریا کی موجوں میں ایک منٹ بھی کسی مسافر کے کام نہیں آتی۔

ان مسلم رہنماؤں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے۔ وہ حق کے ترجمان نہ تھے بلکہ عوامی جذبات کے ترجمان تھے۔ اور جو لوگ اس قسم کی بے حقیقت چیزوں کے اوپر کھڑے ہوں ان کا انجام حقیقت کی اس دنیا میں وہی ہے جو ان رہنماؤں کا ہوا۔

اوپر جس حقیقت کا ذکر کیا گیا، وہ کوئی انوکھی یا غیر معلوم بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ اور دینی تعلیمات میں بالکل واضح ہے۔ اس کے باوجود ہمارے رہنما اور مفکرین کیوں اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ردعمل کی نفسیات نے لوگوں کا ذہنی شاکلہ بگاڑ دیا ہے، اور آدمی کسی بات کو اپنے ذہنی شاکلہ ہی کے مطابق سمجھ پاتا ہے۔ اگر آدمی کا ذہنی شاکلہ مختلف ہو تو وہ کسی طرح اصل بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ہم اس کی ایک مثال پیش کریں گے۔

ایک مشہور مفکر اسلام نے سورہ بنی اسرائیل (آیت ۵) کی تفسیر کے تحت ایک لمبا نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ یہود کے بگاڑ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بد اخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بد اعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔"

اوپر کے اقتباس کے آخری جملہ پر غور کیجئے۔ موصوف کے الفاظ کے مطابق یہ بد اعمالی کی ایک قسم ہے کہ غالب حکومت کے خلاف سیاسی جہاد کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کی جائے۔ گویا انھوں نے ہماری مذکورہ بات کی صداقت کو مزید شدید تر الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے۔ مگر یہی وہ مصنف اور مفکر ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں اس نظریہ کی پر زور وکالت کی کہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے نیا دور لانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ حکمرانوں سے تصادم کر کے ان کو تخت سے بے دخل کیا جائے اور خود اپنی طویل عمر کے تمام بہترین سال انھوں نے اسی قسم کے سیاسی جہاد میں گزار دئے۔

حقیقت کے اس قدر قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے اس قدر بے خبر رہنے کی وجہ صرف شاکلہ کا فرق ہے۔ آدمی ایک آیت کے مطالعہ کے ذیل میں تاریخ انبیاء کے مذکورہ واقعہ کو پڑھتا ہے۔ وہ اس کے علم میں آتی ہے۔ مگر چونکہ اس کا ذہنی شاکلہ مختلف ہے اس لئے یہ حقیقت اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی، وہ اس کی فکر کی تشکیل میں مؤثر ثابت نہیں ہوتی ـــــ ہدایت کے راستہ کو پانے کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے مصنوعی شاکلہ کو توڑے اور فطرت کے حقیقی شاکلہ کے مطابق چیزوں کو دیکھے۔ اس کے بغیر کوئی شخص ہدایت کے ابدی راستہ کو نہیں پا سکتا۔

اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے

قرآن کی دو سورتوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے :

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ
لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(توبہ ۳۳، صف ۹)

اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو ہر دین سے اوپر کردے خواہ شرک کرنے والوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت میں ہدایت کی تفسیر قرآن سے کی گئی ہے اور دین حق کی اسلام سے۔ اور اظہار سے مراد حجت و بیان کے اعتبار سے اس کو سب پر فائق کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے اپنا جو آخری دین اتارا ہے وہ کلی صداقت کا حامل ہے۔ اس کے لئے مقدر ہے کہ وہ ہر دوسرے دین کے مقابلہ میں بالا و برتر ثابت ہو، ہر دوسرا دین اس کے سامنے بے اصل ہو کر رہ جائے۔ اظہار اسلام سے مراد تقریباً اسی قسم کا ایک نظریاتی غلبہ ہے جو موجودہ زمانہ میں جمہوری طرز فکر کو بادشاہی طرز فکر پر، اجتماعی ملکیت کے نظریہ کو انفرادی ملکیت کے نظریہ پر اور طبیعی علوم (سائنس) کو فلسفیانہ علوم پر حاصل ہوا ہے۔

قرآن کا یہ بیان دور اول میں مکمل طور پر واقعہ بن چکا ہے۔ اسلام کے ظہور نے دوسرے تمام مذاہب پر سایہ ڈال دیا۔ اس وقت جو ادیان رائج تھے ـــــ بت پرستی، پارسیت، یہودیت، عیسائیت، سب کے سب خود اپنے پیروؤں کی نظر میں اس طرح بے وزن ہو گئے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئی۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک کو آج مسلم ممالک کہا جاتا ہے، وہ سب نزول قرآن کے وقت غیر مسلم قوموں کی آبادیاں تھیں۔ مگر اسلام کے برتر فکر نے ان کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ اپنے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام کے سایہ میں آگئیں۔

اسلام کی یہ برتری موجودہ زمانہ میں واقعہ نہ بن سکی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اس کو برتر بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ہماری تحریکیں زیادہ تر دوسروں سے سیاسی زور آزمائی میں مصروف رہیں۔ انھوں نے دوسروں کے اوپر اسلام کے فکری اظہار کی جدوجہد نہ کی۔ یہ جدوجہد اگر آج سے ہونے لگے تو آج ہی سے اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے۔

ایک شخص نماز کے لئے مسجد روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا، یہاں تک کہ جماعت کی نماز ختم ہو گئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کو اسلام کی مثبت دعوت کے لئے اٹھنا تھا۔ مگر وہ بعض سیاسی شکایات سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں سے قلمی اور لسانی جنگ لڑنے میں مصروف ہو گئے۔ انھیں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام کی نئی تشریح کر کے سیاسی زور آزمائی ہی کو عین اسلام قرار دے دیا۔ اب ہر ایک سیاست کے کاروبار میں مشغول ہے۔ دین کے مثبت پیغام کو لے کر اٹھنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

توبہ نے طاقت ور بنا دیا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم موسیٰ کے مقابلہ میں غالب رہے تو ہم کو اس کا انعام تو ضرور ملے گا۔ فرعون نے کہا ہاں۔ اس کے بعد جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی مانند نظر آنے لگیں۔ اب حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا۔ آپ کا عصا اژدہا بن کر گھوما تو اس کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں کی ہر لکڑی لکڑی اور ہر رسی رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ نے جو چیز دکھائی ہے وہ جادو نہیں بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ ان کا سینہ حق کے لئے کھل گیا۔ اور انھوں نے اسی وقت ایمان قبول کر لیا۔ فرعون غضب ناک ہو کر بولا: تم لوگ موسیٰ کے مومن بن گئے قبل اس کے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ یہ تم لوگوں کی خفیہ سازش ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور پھر تم سب لوگوں کو سولی پر چڑھا دوں گا (اعراف) —— جادوگروں نے جواب دیا: اس ذات کی قسم جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی روشن نشانیوں کے مقابلہ میں ہم تم کو ترجیح دیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہو کر لو۔ تم صرف اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو اور اللہ زیادہ اچھا ہے اور وہ باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ)

وہی جادوگر جو ابھی فرعون کے سامنے خوشامدی باتیں کر رہے تھے اور اس کے انعام اور اعزاز کے طالب تھے وہی تھوڑی دیر بعد اتنے دلیر اور بلند حوصلہ ہو گئے کہ فرعون کی انھیں کوئی پروا نہ رہی۔ حتیٰ کہ فرعون کی طرف سے سخت ترین سزا کی دھمکی بھی انھیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے جادوگروں کو اچانک پستی سے بلندی اور بزدلی سے بہادری تک پہنچا دیا۔ وہ ایمان کی طاقت تھی۔ انھوں نے انسانوں سے گزر کر خدا کو پا لیا تھا، پھر ان کو انسانوں کا ڈر کیوں ہوتا۔

شہر کے مسلم محلہ کو تخریب کاروں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ مسلمان اپنے گھروں سے نکلے تو تخریب کاروں نے پتھر پھینکنے شروع کئے۔ مسلمانوں نے بھی اس کے جواب میں پتھر پھینکے۔ تخریب کاروں کو جب پتھراؤ سے کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو انھوں نے بندوقوں سے فائر کئے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان بھاگے اور اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ اب تخریب کاروں کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر محلہ میں گھس گئے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اب محلہ کے ایک بدنام شخص کو اللہ نے ہمت دی اور اس نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس شخص میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ البتہ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ اپنے

کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیمم کیا اور سجدہ میں گر پڑا۔ سجدہ کی حالت میں اس نے دعا کی: خدایا آج تو ہماری عزت رکھ لے اور ہماری مدد کر۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ اس نے یہ دعا کی اور اس کے بعد پڑوسی کی بندوق لی اور تھیلہ میں کارتوس بھر کر مجمع میں گھس گیا۔ اس نے چن چن کر تخریب کاروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی ہر وقت تخریب کاروں کے نشانہ کی زد پر تھا مگر اس وقت ڈر اس کے دل سے بالکل نکل گیا تھا۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ تخریب کاروں نے جب دیکھا کہ ان کے بہت سے ساتھی خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں اور ”ہائے مار ڈالا“ کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے (فاطر ۱۰) مذکورہ مسلمان کی دعا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس نے جب اپنی دعا کے ساتھ شراب چھوڑنے کا عہد کیا تو اس نے ایک نیک عمل کیا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے اس کی دعا اوپر اٹھ کر فوراً خدا کی بارگاہ میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ جب بھی آدمی اپنی دعا کے ساتھ اس قسم کا کوئی نیک عمل کرے تو اس کی دعا ضرور قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ دعا کے ساتھ اس کے موافق نیک عمل دعا کے معاملہ میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کا ثبوت ہے، اور جب آدمی اپنی مانگ میں سنجیدہ ہو تو اس کی مانگ ضرور پوری کی جاتی ہے۔

اس واقعہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جب آدمی نے یہ کہا کہ ”خدایا میں آج سے شراب کو چھوڑتا ہوں تو میری مدد کر“ تو اس نے اپنی طاقت کو بڑھایا۔ کیوں کہ اب اس نے خدا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ صرف ”خدایا مدد کر“ کے الفاظ بولتا تو اس سے اس کے اندر وہ یقین نہ آتا۔ کیوں کہ یہ چھپا ہوا خیال پھر بھی اس کے دل میں باقی رہتا کہ میں خدا کو پکار رہا ہوں حالاں کہ میں خدا کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جب اس نے شراب چھوڑنے کا عزم کیا تو پھر پورے طور پر اس کو یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ کیونکہ اب اس نے اپنے اور خدا کے درمیان پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا دیا تھا۔ پہلی صورت میں اس کی مثال اگر چور کی سی تھی تو اب اس کی مثال اس شخص کی سی ہو گئی جس نے سامان کی قیمت اس کے دکان دار کو ادا کر دی ہو۔ اس کی توبہ نے اس کو نڈر بنایا اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ توبہ کے فوراً بعد اس کے اندر سے احساسِ جرم نکل گیا۔ اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا کہ میں خدا سے دور ہوں۔ اب وہ خدا کی مدد کو اپنے حق میں یقینی سمجھنے لگا۔ اس کے اور خدا کے درمیان جو رکاوٹ تھی جب اس رکاوٹ کو اس نے دور کر دیا تو اندیشوں کے تمام غبار اس کے دل سے ہٹ گئے۔ خدا اس کو اپنا نظر آنے لگا، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بنا چکا تھا۔

معیار کی تبدیلی

ہجرت کے دوسرے سال بدر کے مقام پر مسلمانوں میں اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش کی سرداری ابوجہل کو حاصل تھی۔ جنگ سے ایک دن پہلے اس نے خدا سے اپنی فتح کی دعا کی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:
خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہو تو کل کے دن اس کو ہلاک کردے
(اللھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ)

ابوجہل کو خدا سے یہ کہنا تھا کہ وہ قریش کو مسلمانوں کے اوپر فتح دے۔ اس کی یہ بات اسی وقت باوزن ہو سکتی تھی جب کہ وہ یہ بھی دکھا سکے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کا گروہ حق پر ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے قطع رحم کو فیصلہ کی بنیاد بنایا۔ کیونکہ اسلام کی دعوت نے قریش کے خاندانوں میں باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔ اس معیار پر جانچنے کی صورت میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اپنا گروہ حق پر ہے اور مسلمانوں کا گروہ باطل پر۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے خدا کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ معیار قائم کیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو چاند پر سے نظر آنا چاہئے۔ جب روس کے راکٹ نے اپنے چاند کے سفر کی رپورٹ میں خدا کا کوئی نشان نہیں بتایا تو خروشچوف نے اعلان کر دیا: خدا کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نظر نہیں آیا۔

یہی غلطی مختلف شکلوں میں خود اسلام میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کون اسلام پر ہے اور کون اسلام پر نہیں ہے۔ اس کا ایک خدائی معیار ہے۔ لیکن اگر آپ اس معیار کو بدل دیں تو آپ کے لئے سارا معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ذاتی معیار کی بنا پر دین کو بے دینی سمجھ لیں گے اور بے دینی کو دین۔

اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ دعوت دین کی بنیاد اکابر کے ملفوظات ہیں تو آپ کو وہ دعوت دینی دعوت نظر نہ آئے گی جس کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی گئی ہو۔ اگر آپ یہ معیار قائم کر لیں کہ دین وہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت پیدا کرے تو آپ کو وہ دین دین معلوم نہ ہوگا جو خدا سے عقیدت پیدا کرنے والا ہو۔ اگر آپ کا ذہن یہ ہو کہ کامل دین وہ ہے جو سیاسی انقلاب کا علم بردار ہو تو آپ کو وہ دین ناقص دین دکھائی دے گا جو فرد کے اندر نفسیاتی انقلاب پر زور دیتا ہو۔ اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ جہاد اور عزیمت کے مقام پر وہ ہے جو حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ کی مہم چلائے تو آپ کو وہ شخص جہاد اور عزیمت کے مقام سے گرا ہوا نظر آئے گا جو یہ کہے کہ حکمرانوں سے تصادم نہ کرتے ہوئے غیر سیاسی دائرہ میں کام کرو۔ اگر آپ یہ معیار بنا لیں کہ جو شخص فروعی مسائل اور فنی موشگافیوں میں کمال رکھتا ہو وہی ماہر دینیات ہے تو آپ کو وہ شخص علم دینیات کا ماہر نظر نہ آئے گا جو خوف خدا اور فکر آخرت کی باریکیوں کو بیان کرتا ہو۔ اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم احیاء ملت کی مہم ہے تو آپ ملت کے اندر خود تعمیری کی تحریک کو احیائے ملت کی تحریک سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

حکم آنے کے بعد

شراب اور جوا اسلام میں حرام ہیں۔ مگر ان کے بارے میں احکام بتدریج اتارے گئے۔ شروع میں یہ آیت اتری کہ شراب اور جوا گناہ کے فعل ہیں، اگرچہ اس میں لوگوں کے لئے کچھ ظاہری فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹)

اس وقت عرب کے لوگ جوئے اور شراب کے عادی تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ انھیں صاف لفظوں میں منع نہیں کیا گیا ہے تو یہ کہہ کر بدستور ان میں مشغول رہے کہ یہ دونوں چیزیں ہم پر حرام نہیں کی گئی ہیں۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں گناہ ہے اور کچھ فائدہ بھی (فقال الناس ما حرما علینا، انما قال: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ)

اس کے بعد سورہ مائدہ میں صاف حکم اترا کہ شراب اور جوا گندی چیزیں ہیں اور شیطانی فعل ہیں، تم ان سے بچو۔ یہ حکم دیتے ہوئے جب قرآن میں یہ الفاظ آئے کہ فهل انتم منتهون (کیا تم ان سے باز آؤ گے) تو صحابہ کرام بول اٹھے: انتهینا ربنا، انتهینا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو اسے سنایا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اس کے گھر میں شراب موجود تھی۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان اما علمت ان اللہ حرمها۔ فاقبل الرجل علی غلامہ فقال اذهب فبعها۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یافلان بماذا امرتہ۔ فقال امرتہ أن یبیعها۔ قال ان الذی حرم شربها حرم بیعها فامربها فافرغت فی البطحاء (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے شخص، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جاؤ شراب کو بیچ دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے شخص تم نے اپنے لڑکے کو کیا حکم دیا ہے۔ آدمی نے کہا میں نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ شراب کو بیچ دے۔ آپ نے

فرمایا، جس چیز کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے اس کے بعد اس نے حکم دیا اور اس کی شراب بطحا میں بہادی گئی

مومن کے اندر بھی وہی جذبات ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہوتے ہیں۔ کبھی خواہش کے زیر اثر وہ لفظی تاویل کرتا ہے، کبھی اس کے اوپر مال کی محبت غالب آجاتی ہے۔ مگر یہ سب اس وقت تک ہے جب تک خدا کا حکم اس کے سامنے نہ آئے۔ خدا کا واضح حکم سامنے آتے ہی وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لفظی تاویلوں کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مال یا کسی دوسری چیز کی محبت کو بھی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتہ ہونے کا ثبوت دے۔ یعنی کبھی کوئی غلطی نہ کرے اور نہ کبھی کوئی برا خیال اس کے دل میں آئے۔ اس قسم کی پارسائی فرشتوں سے مطلوب ہے نہ کہ انسان سے۔ انسان سے اس کے رب کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ تنبیہ کے بعد غلطی پر اصرار نہ کرے۔

انسان کو جن جذبات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور جس قسم کی دنیا میں اس کو رکھا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں غلط خیالات آئیں گے۔ وہ غلط باتیں سوچے گا اور عملاً بھی غلط کام کر گزرے گا۔ مگر اس قسم کی کسی غلطی کو وقتی غلطی ہونا چاہئے نہ کہ مستقل۔ جب بھی آدمی کا ضمیر ٹوکے یا کوئی خارجی آواز اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرے تو اس وقت اس کو ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے سیدھے طریقہ پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے اور فوراً اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ جانا چاہئے۔

انسان کا کمال غلطی کر کے دوبارہ پلٹ آنے میں ہے نہ کہ سرے سے غلطی نہ کرنے میں۔ غلطی ہو جانا جرم نہیں ہے۔ بلکہ غلطی پر قائم رہنا جرم ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت ان متقیوں کے لئے ہے جن کا حال یہ ہو کہ جب وہ کوئی برائی کر بیٹھیں یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر ڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے ہوئے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے (آل عمران ۱۳۵)

جب آدمی عقل کھو دے

پندرھویں صدی قبل مسیح تک مصر میں عمالقہ کی حکومت تھی جو مصر کے باہر سے آکر مصر کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ یوسف علیہ السلام اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد مصر میں قومی انقلاب ہوا۔ عمالقہ کی حکومت ختم ہو گئی اور ایک ملکی خاندان نے مصر کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور اپنا لقب فرعون اختیار کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سابق حکمراں قوم (بنی اسرائیل) سے تعلق رکھتے تھے اور فراعنہ میں سے ایک فرعون کے پاس خدا کا پیغام لے کر بھیجے گئے۔

فرعون اپنے زمانہ میں بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ حضرت موسیٰ جب اس کے دربار میں آکر کھڑے ہوئے تو فرعون نے ان کو حقیر سمجھا۔ دبے ہوئے فرقہ کا ایک فرد، جس کے پاس نہ شان دار کپڑے تھے اور نہ پرشکوہ سواری، نہ اس کے آس پاس دنیوی اہمیت کی اور کوئی چیز موجود تھی، اچانک بادشاہ کے دربار میں آکر کہتا ہے کہ میں تمھارے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری ہنس پڑے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی بات کو مذاق سمجھا۔ ان کے لئے ناقابل فہم تھا کہ اتنی معمولی حیثیت کا آدمی خدا کا نمائندہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کے پیغام کو اس کے دلائل کے اعتبار سے نہیں دیکھا بلکہ اِس اعتبار سے دیکھا کہ اس کا پیش کرنے والا کیسا ہے۔ اور جب انھیں نظر آیا کہ پیش کرنے والا ایک معمولی آدمی ہے تو انھوں نے ان کی بات کو، دلائل کی عظمت کے باوجود، حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

حضرت موسیٰ کی بات ملک میں پھیلنے لگی اور بہت سے لوگ اس کے وزن کو محسوس کرنے لگے۔ اس وقت فرعون نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس کی باتوں پر دھیان دے رہے ہو۔ یہ شخص تو عجیب الجھی ہوئی باتیں کرتا ہے۔ ابھی تک یہ واضح نہ ہو سکا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ دوسری طرف میرا معاملہ ہے کہ میں صاف اور سمجھ میں آنے والی بات کہتا ہوں۔ میرے برسرِ حق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خدا نے مجھ کو بڑائی عطا کی ہے۔ اس ملک کا اقتصادی نظام میرے حکم کے تحت چل رہا ہے، موسیٰ اگر خدا کے نمائندے ہیں تو "کیوں نہ ان پر سونے کے کنگن اتارے گئے۔ یا فرشتوں کا دستہ ان کے ساتھ ہوتا" فرعون کی یہ باتیں اس حد تک کارگر ہوئیں کہ اس نے اپنی قوم کی عقل کھو دی اور قوم نے اس کا کہنا مان لیا، وہ پہلے ہی سے فاسق لوگ تھے (زخرف ۵۴)

جب بھی حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو اس کی زد سب سے پہلے ان لوگوں پر پڑتی ہے جو کسی چلے ہوئے مذہب کے بل پر عوامی قیادت حاصل کئے ہوں، ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ داعی کی باتوں سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں تو وہ کچھ دلفریب باتیں کہہ کر لوگوں کے ذہن کو اس سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ داعی کے کھلے ہوئے دلائل کے مقابلہ میں ان کی پُرفریب باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ تاہم اکثر لوگ چونکہ حق اور ناحق کے معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتے وہ گہرائی کے ساتھ دونوں باتوں کا موازنہ نہیں کرتے اور قائدین کی خوش نما باتوں میں آکر ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور حق کے داعی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

متحدہ محاذ کی سیاست

یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے۔ لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور ہر صبح شام ایک نئی حکومت کے منتظر تھے جس کی ایک روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی — دوسری طرف ہاشمی (یا عباسی) خاندان کے کچھ لوگ بنی امیہ کے کھنڈر پر اپنی شاہی عمارت اٹھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال نے ایک طرف عوام اور دوسری طرف عباسی حوصلہ مندوں کے لئے ایک مشترک نقطہ فراہم کردیا ——— بنی امیہ کا خاتمہ۔ اگرچہ مظلوم عوام کے لئے اس کا محرک کچھ اور تھا اور عباسی حوصلہ مندوں کے لئے کچھ اور۔ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳۲ھ میں خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہوگیا اور سفاح تخت نشین ہوا، جو عباسیوں کا پہلا خلیفہ تھا۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا۔ ۱۳۶ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ بنوامیہ کے آخری زمانہ میں جو لوگ ان کے خلاف تحریک چلا رہے تھے ان میں محمد بن عبداللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ امام حسن ابن علی کی اولاد سے تھے۔

بنوعباس جو نسلی وجوہ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے اور اموی سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں مذکورہ بالا دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک کا علم ہوا تو وہ ان سے مل گئے۔ حتیٰ کہ خود المنصور (جو بعد کو خلیفہ ہوا) نے نفس زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اموی سلطنت ختم ہوئی اور عباسی سلطنت اس کی جگہ قائم ہوگئی۔ مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مظالم اور زیادہ بڑھ گئے، حتیٰ کہ شاعر کو کہنا پڑا:

فمہلا یابنی العباس مہلا　لقد کویت بغدرکما الصدور

اے بنی عباس اپنا ظلم چھوڑ دو تمھاری غداری سے سینے داغدار ہو چکے ہیں۔

چنانچہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی دونوں روپوش ہوگئے اور جو "انقلابی تحریک" پہلے وہ بنی امیہ کے خلاف چلا رہے تھے اس کو اب بنوعباس کے خلاف چلانے لگے۔ یہاں تک کہ موقع پاکر انھوں نے خروج (سلطنت سے بغاوت) کا اعلان کردیا اور مدینہ میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد ان کا جو انجام ہوا وہ یہ کہ نفس زکیہ ۱۴۵ھ میں مارے گئے اور ان اور ان کا سر منصور کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہی منصور جس نے ان کے ہاتھ پر نوجوانی کی عمر میں بیعت کی تھی

عباسی سلطنت کے قیام سے پہلے نفس زکیہ کی تحریک اور عباسی تحریک دونوں کا مشترک دشمن ایک تھا یعنی بنوامیہ۔ مگر جب عباسی تحریک نے بنوامیہ کی تحریک کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور عباسی سلطنت قائم ہوگئی تو اب صورت حال بدل گئی۔ اب عباسی سلطنت کے لئے نفس زکیہ دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ موجودہ عباسی سلطنت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہی المنصور جو "انقلاب" سے پہلے نفس زکیہ کا حلیف تھا، اب ان کا دشمن بن گیا۔ اس نے ان کی تحریک کو ختم کرنے میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ دو مہینے تک لباس نہیں بدلا اور بستر پر نہیں سویا۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک اس نے اس تحریک کو ختم نہ کرلیا۔

تاریخ کا یہ تجربہ ایک ہزار سال پہلے پیش آچکا تھا جو بتا رہا تھا کہ مختلف محرکات رکھنے والے لوگ جب کسی مقصد کے لئے متحدہ محاذ بناتے ہیں تو اس کا فائدہ ہمیشہ اس فریق کو حاصل ہوتا ہے جو زیادہ زور آور اور ہوشیار ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور لوگ بار بار اسی ناکام تجربہ کو دہراتے رہے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۷) نے مصر میں احیائے ملت کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے قوم پرستوں کی ایک انجمن الحزب الوطنی کے نام سے قائم کی جس کے ممبروں کی تعداد کافی وسیع تھی۔ اس میں شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول پاشا، عبداللہ نعیم بے اور احسان بے جیسے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مصر میں جمال الدین افغانی کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ وہاں کی با اثر جماعت جمعیت ماسونیہ نے ان کو اپنا صدر نامزد کیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب جمال الدین افغانی کی انجمن کا ایک خفیہ رکن توفیق پاشا مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہوگیا۔ اگرچہ اس کامیابی میں فرانس اور برطانیہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جمال الدین افغانی اور ان کے "قوم پرست" ساتھی بہت خوش ہوئے۔ انھیں نظر آیا کہ ان کی دیرینہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ یہ محض سراب تھا۔ توفیق پاشا نے تخت پر بیٹھتے ہی جمال الدین افغانی اور ان کے مخصوص خادم ابو تراب کو مصر سے جلا وطنی کا حکم دے دیا۔ توفیق پاشا، سید جمال الدین افغانی کی خفیہ مجلسوں میں شریک ہو چکا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لوگ امپیریلزم کے شدید مخالف ہیں۔ چوں کہ توفیق پاشا کو انھیں امپیریلیسٹ طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی حمایت سے کام کرنا تھا، اس لئے اس نے مصر میں ان کی موجودگی کو حکومت کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ اس نے فوج اور پولس کی کڑی نگرانی میں جمال الدین افغانی اور ان کے خادم کو سوئز بھیج دیا اور وہاں انھیں بجبر کشتی پر سوار کرکے روانہ کر دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ صرف نصف صدی بعد اسی حصہ میں ٹھیک اسی غلطی کو دوبارہ اس سے زیادہ بری شکل میں دہرایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب مصر میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فوجی افسروں نے ملک میں حکومت قائم کرلی تو ایک صاحب مجھ سے ملے۔ "مولانا..... مصر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں" انھوں نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ جو مصر میں انقلاب ہوا ہے، بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ فوجی انقلاب ہے، مگر حقیقۃً اخوانی اس انقلاب کے ہیرو ہیں۔ اب مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت ہوگی، مولانا اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اخوانی لیڈروں کو نصیحت کریں اور اسلامی نظام کی تعمیر کے لئے انھیں مفید مشورے دیں"

یہ واقعہ ہے کہ مصر میں جو فوجی افسر انقلاب لائے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کے اخوان المسلمین سے تعلقات تھے۔ وہ اخوانی تحریک کی تائید کرتے تھے۔ حتٰی کہ خود جمال عبد الناصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخوانیوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ صدر سادات کا بیان ہے کہ فوجی افسروں کی "انقلابی کونسل" نے ان کو مامور کیا تھا کہ وہ اخوانیوں سے رابطہ قائم کریں اور انقلابی جد و جہد کے سلسلہ میں ان کی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ جس رات کو شاہ فاروق

کی حکومت کا تختہ الٹا گیا ہے۔ اخوانی رضا کار قاہرہ کی سڑکوں پر پہرہ دینے میں مشغول تھے۔ وہ ان خفیہ باتوں کے بھی راز دار تھے جن میں شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔

"جب اخوان المسلمین اور فوجی افسروں کے اشتراک سے مصر میں انقلاب آیا تھا تو کیوں ایسا ہوا کہ فوجی افسروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اخوانیوں کو ختم کر دیا" یہ سوال اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ جواب بالکل سادہ ہے۔ یہ "اشتراک"، اسی قسم کی ایک غلطی تھی جس کا نمونہ اوپر کی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

شاہ فاروق کی فوج کے کچھ جونیر افسر فاروق کی قبر کے اوپر اپنی حکمرانی کا تخت بچھانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں شبہ تھا کہ وہ تنہا اپنے اس خواب کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف اخوان المسلمین مصر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی اس تمنا کو کس طرح واقعہ بنائیں — دونوں کی راہ کی رکاوٹ بظاہر صرف ایک چیز تھی، شاہ فاروق کی حکومت۔ اس صورت حال نے دونوں گروہوں کے لئے ایک مشترک نقطۂ اتحاد فراہم کر دیا۔ باہم ملاقاتیں اور دوستیاں شروع ہوگئیں۔ خفیہ مجالس میں شاہ کے خلاف اسکیمیں بننے لگیں۔ دونوں خوش ہو گئے کہ مقصد کے حصول کا قریبی موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر جب حکومت بدلی تو فطری طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو زیادہ ہوشیار اور عملی طور پر حکومت سے قریب تر تھے اور اتفاق سے یہ وہی لوگ تھے جن کو اسلامی یگانگت سے زیادہ ذاتی حوصلوں کی تکمیل کے شوق نے فریق ثانی سے قریب کیا تھا۔ انقلاب کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان حوصلوں کی تکمیل میں پہلے جہاں شاہ فاروق کی شخصیت حائل تھی وہاں اب یہ "قدیم دوست"، آکر کھڑے ہو گئے ہیں یا کم از کم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ حل بہت آسان تھا۔ پہلے کے فوجی افسر اب ملک کے حکمراں بن چکے تھے۔ انھوں نے اپنے قدیم دوستوں کو اس سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹا دیا جس کا مظاہرہ انھوں نے شاہ فاروق کی معزولی کے وقت کیا تھا۔

اسی اتحادی سیاست کو مزید بدتر شکل میں پاکستان میں دہرایا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا اور صدر ایوب کی "ڈکٹیٹر شپ"، ملک میں قائم ہو گئی۔ یہ صورت حال ملک کے بہت سے لوگوں کے لئے پریشان کن تھی۔ ان میں ایک طبقہ "اسلام پسند"، حضرات کا تھا، یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے علم بردار تھے اور صدر ایوب اور ان کی "بنیادی جمہوریت"، ان کے نزدیک اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ دوسرا گروہ سیکولر اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والوں کا تھا۔ ان کو بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ "بنیادی جمہوریت"، کے ہوتے ہوئے وہ ملک کے اقتدار پر قبضہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کو ختم کیا جائے۔ دونوں گروہ آخری منزل کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ تاہم دونوں محسوس کرتے تھے کہ "صدر ایوب" کی ذات دونوں کے لئے یکساں رکاوٹ ہے۔ اشتراک کی اس منفی بنیاد نے دونوں کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر یک جا کر دیا۔ اور پھر دونوں نے مل کر ملک میں وہ طوفان مچایا کہ خود ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ یہ متحدہ محاذ جو بڑے بڑے دعووں کے ساتھ بنایا گیا تھا جب اپنے آخری انجام کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا سارا فائدہ سیکولرزم اور سوشلزم کے علم برداروں

کے حصہ میں آیا ہے اور اسلام پسند گروہ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ساری طاقت خرچ کر کے سیاست کے صحرا میں ملوما مدحودا بنے رہیں ۔

اب اسی نادان سیاست کو ہندوستان کے کچھ مسلم قائدین نے اس ملک میں درآمد کیا ہے ۔ وہ معاہداتی سیاست کے نعرے لگا رہے ہیں ۔ الیکشن کے موقع پر وہ ایک سیاسی پارٹی سے مل کر دوسری پارٹی کو شکست دیتے ہیں ۔ مگر قوم کے بے شمار وسائل کو خرچ کرنے کے بعد ان کے حصہ میں جو آخری چیز آئی ہے وہ صرف یہ کہ الکشن کے بعد جب لوگ اسمبلیوں پر قبضہ کر لیں اور وزارتیں بنا لیں تو ہمارے لیڈر اسٹیج پر نمودار ہو کر یا پریس کانفرنس کر کے یہ "انکشاف" کریں کہ جیتنے والوں نے ہم سے فلاں فلاں وعدے کئے تھے جو پورے نہیں کئے گئے ۔ ۱۹۶۶ کے الکشن میں معاہداتی سیاست کے رہنماؤں نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ریاستوں میں حکمراں کانگریس کو شکست دی ۔ ۱۹۷۷ کے الکشن میں اندرا گاندھی کی شکست کے بعد ایک مسلم رہنما نے کہا "آج ہم نے ظلم کا بیڑا غرق کر دیا" مگر ان فتوحات کے باوجود اصل صورت حال آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ پہلے تھی ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی غلطی کو ہم کب تک دہراتے رہیں گے ۔ اصل سیاست یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو طاقتور اور مستحکم بنایا جائے ۔ سیاسی اشتراک یا متحدہ محاذ ہمیشہ اس فریق کے لئے مفید ہوتا ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فیصلہ کن پوزیشن کا حامل ہو، اندرونی کمزوری اور انتشار کو درست کرنے سے پہلے متحدہ محاذ کی طرف دوڑنا نادانی کے سوا اور کچھ نہیں ۔ (اگست ۱۹۷۲)

اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جہاں تک جزوی امور میں تعاون کا تعلق ہے ۔ اس قسم کا تعاون ہر ایک سے لیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ کافر و مشرک سے بھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے نازک سفر میں عبد اللہ بن اُرَیقِط کو رہنما بنایا جو کہ مشرک تھا ۔ صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے ۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ مشرک تھے ۔ امام زہری نے روایت کیا ہے :

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم استعان بناس من الیھود فی حربہ فاسھم لھم (رواہ سعید فی سننہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض یہودیوں سے جنگ کے موقع پر مدد لی تو ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا ۔

مگر یہ جزوی اور انفرادی تعاون کی مثالیں ہیں ۔ کلی جدوجہد کے سلسلہ میں کبھی اغیار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔ خاص طور پر وہ جدوجہد جو "غیر صالح حکمراں" کو ہٹا کر اس کی جگہ "صالح حکمراں" کو لانے کے لئے کی جائے ۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد تمام تر جماعت صالحہ کی اپنی طاقت پر ہونا چاہئے ۔ کوئی جماعت صالح اگر اپنے بل پر انقلاب لانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کا غیر سیاسی دائرہ عمل میں کام کرنے پر قانع رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر صالح عناصر کو لے کر عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے ۔ یہ غیر صالح عناصر اپنے مزاج کی بنا پر ایسا کبھی نہیں کر سکتے کہ "غیر صالح حکمراں" کو بے دخل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور خالی شدہ تخت کو تمام تر جماعت صالحہ کے حوالے کر دیں ۔ وہ لازماً یہ چاہیں گے کہ تخت پر خود قبضہ کریں ۔ اس وقت "متحدہ محاذ" کے اندر باہمی کشمکش شروع ہوگی جو یقینی طور پر غیر صالح عناصر کے غلبہ پر ختم ہوگی ۔ ساری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے ۔

سب سے بڑی ضمانت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ والے لوگ اللہ کے محبوب ہیں (التوبہ ۳۶) ان کے لئے نہ خوف ہے اور نہ غم (الاعراف ۳۵) ان کے لئے خدا آسانی پیدا کرتا ہے (اللیل ۵) ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے (آل عمران ۱۷۲) ان کے لئے زمین و آسمان کی برکتیں کھول دی جاتی ہیں (الاعراف ۹۶) ان کو اللہ کی خصوصی مدد ملتی ہے (آل عمران ۱۲۵) ان کے لئے اللہ گنجائش اور کشادگی پیدا کرتا ہے (الطلاق ۲) ان کے معاملات میں آسانی پیدا کی جاتی ہے (الطلاق ۴) وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں (النور ۵۲) انجام کار صرف ان کے لئے ہے (القصص ۸۳) وغیرہ۔

تقویٰ اہل ایمان کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مخالفوں اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ تقویٰ سے یہ عظیم فائدے کس طرح حاصل ہوتے ہیں، اس کے لئے مندرجہ ذیل روایت پر غور کیجئے:

ان عمر بن الخطاب سأل اُبَیَّ بن کعب عن التقویٰ۔ فقال له اما سلکت طریقاً ذا شوك۔ قال بلیٰ۔ قال فما عَملتَ۔ قال شمرت و اجتهدت۔ قال فذلك التقویٰ۔ تفسیر ابن کثیر ۴۰/۱)	حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جہاں کانٹے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دامن سمیٹ لئے اور خوب بچ بچ کر چلا۔ انھوں نے کہا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

ابن المعتز نے تقویٰ کے اسی مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغیرها وکبیرها ذاك التقیٰ   واصنع کماش فوق ارض الشوك یحذر ما یریٰ

تقویٰ یہ ہے کہ تم چھوٹے اور بڑے گناہوں کو چھوڑ دو، اور کانٹے دار زمین پر چلنے والا جس طرح بچ بچ کر چلتا ہے، اسی طرح تم بھی کرو۔

تقویٰ (و ق ی) کا اصل مفہوم بچاؤ ہے۔ یعنی اذیت اور ضرر والی چیزوں سے بچ کر رہنا (مفردات راغب اصفہانی) نجات اور کامیابی کو تقویٰ کے عمل سے وابستہ کر کے اللہ تعالیٰ نے زندگی

کا اہم ترین راز بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کو حاصل کرنے کی سب سے ضروری شرط ناکامی کے اسباب سے بچنا ہے۔ اس دنیا میں فائدہ اپنے آپ آ رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی ان نقصان والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے جو آتے ہوئے فائدے کو اس کی طرف آنے میں مانع بن جائیں۔

گویا فائدہ اور کامیابی کا معاملہ عین وہی ہے جو سورج کا معاملہ ہے۔ سورج کی روشنی اپنے آپ ہر آدمی کی طرف بے پناہ مقدار میں آ رہی ہے۔ آدمی کے ذمہ جو کام ہے، وہ صرف یہ کہ وہ اپنے اور سورج کی روشنی کے درمیان کسی چیز کو آڑ یا رکاوٹ نہ بننے دے۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے بھی آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے جو آنے والی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی ہوں۔ آدمی نے اگر اس کا اہتمام کر لیا تو کامیابی اس کی طرف آکر رہے گی۔ وہ کسی حال میں رکنے والی نہیں۔

اس تقویٰ کا ایک پہلو یہ ہے کہ نفس اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ اور ان سے دور رہتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ مثلاً خدا کی یاد سے غافل ہونا۔ آخرت کی پکڑ سے نہ ڈرنا، خدائی حدوں کو توڑنا، اخلاق اور معاملات میں من مانی کارروائی کرنا۔ مخلوقات کی پرستش میں مبتلا ہونا، اس قسم کی تمام چیزیں انسان کو گھاٹے میں ڈالنے والی ہیں۔ وہ آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔ جو ایسا کرے گا وہی جنت میں پہنچے گا۔

یہ تقویٰ جو اہل ایمان کے لئے آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہی ان کی دنیا کی کامیابی کا ضامن بھی ہے۔ جو متقیانہ روش ان کی آخرت کو سنوارتی ہے، وہی ان کی دنیا کو سنوارنے کا بھی یقینی ذریعہ ہے۔

اس دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں اور شریر لوگ بھی۔ یہ شریر لوگ بدکلامی کریں گے۔ وہ طرح طرح سے تکلیف پہنچائیں گے۔ وہ اشتعال انگیز کارروائیاں کریں گے۔ وہ اسلام کے خلاف سازشیں کریں گے۔ وہ ایسے کام کریں گے جن سے اہل ایمان کے جذبات میں برہمی پیدا ہو جائے۔ مگر ایسے تمام مواقع پر اہل ایمان کو ہمیشہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہنا ہے۔ برے انسان ان کی راہ میں کانٹے بچھائیں گے، مگر انھیں ان کانٹوں سے بچ کر اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز کانٹوں سے بچنا ہے نہ کہ کانٹوں سے الجھنا۔

امتحان کی قیمت

تین عورتیں انسانی تاریخ کی معیاری عورتیں ہیں —— آسیہ، مریم اور خدیجہ۔ یہ وہ نیک بندیاں ہیں جنھوں نے کبھی کوئی برائی نہیں کی۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تینوں کو دنیا میں بے پناہ دکھ جھیلنا پڑا۔ حضرت آسیہ کا یہ انجام ہوا کہ مصر کے فرعون نے مخالف سمتوں سے ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوایا اور اس کے بعد انھیں سولی پر چڑھا دیا۔ حضرت مریم کو فلسطین کے یہودیوں نے ذلیل کیا اور ان پر زنا کا الزام لگایا۔ حضرت خدیجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ تین سال تک عرب کے گرم پتھروں کے درمیان اس طرح رہیں کہ ان کا رنگ کالا پڑ جائے۔ درخت کی جڑیں اور پتیاں کھانے کی وجہ سے جانوروں کی طرح مینگنیاں کریں اور آخر کار شدید تکلیف میں اس دنیا سے چلی جائیں۔

یقیناً خدا کے علم میں تھا کہ یہ تینوں خواتین جنتی ہیں۔ وہ ان کو اچھے حالات میں رکھ سکتا تھا جس طرح وہ انھیں آخرت میں اچھے حالات میں رکھے گا۔ اس کے باوجود خدا نے گوارا کیا کہ یہ پاکیزہ ترین نسوانی روحیں انسانی بھیڑیوں کے قبضہ میں آئیں اور وہ ان کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کریں جو انھوں نے کیا۔ اس کی واحد وجہ خدا کی سنتِ امتحان ہے۔ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ ظالموں کا ظالم ہونا ثابت کرے اور ان کے معاشرہ کو اس بات کا مجرم ٹھہرائے کہ انھوں نے کھلے ہوئے فساد کو دیکھا پھر بھی فسادیوں کو روکنے کے لئے نہیں اٹھے۔ انھوں نے بے گناہ زندگیوں پر گنہ گاروں کو شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے پایا مگر وہ خاموش رہے۔

ایسا واقعہ کسی بے داغ انسان ہی کے ذریعہ ظہور میں آسکتا ہے۔ جس طرح چیزوں کو ہمیشہ صحیح ترین باٹ سے تولا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کے ظلم و فساد کو ایسے انسانوں ہی کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے جو خود بے داغ ہوں۔ جو انتہائی بے ضرر ہوں اس کے باوجود لوگ ان کے ساتھ شیطانی حرکتیں کریں جن کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے پھر بھی لوگ ان کو اپنی بد باطنی کا نشانہ بنائیں۔

زیادہ تر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کا معاملہ ملا جلا ہوتا ہے۔ وہ مظلوم ہوتے ہیں تو اسی کے ساتھ وہ ظالم بھی ہوتے ہیں۔ انھیں کسی سے برائی پہنچی ہے تو انھوں نے خود بھی اس کو برائی پہنچائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ خدا کی ترازو نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر آپ دوسرے کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائی کریں اور اس کے نتیجہ میں دوسرا شخص آپ کے خلاف فساد کرنے لگے تو آپ کا واقعہ دوسرے شخص کے ظلم کو ناپنے کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر آپ کسی سے چھین جھپٹ کریں اور اس کے بعد وہ آپ سے مار پیٹ کرنے پر اتر آئے تو آپ کبھی وہ آدمی نہیں بن سکتے جس کے ذریعہ خدا دوسرے شخص کے ظلم کو ناپے اور اس کو اس کی بدکرداری کی سزا دے۔

ترازو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو درست بناتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ٹھہرتا ہے کہ وہ نا درست چیزوں کو ناپے اور تولے۔ اگر ترازو میں بھی کچھ فرق ہو جیسے دوسری چیزوں میں فرق ہوتا ہے تو ایسا ترازو ترازو بننے کے لائق نہیں۔ یہی معاملہ انسان کی اخلاقی پیمائش کا بھی ہے۔ انسانوں کی اخلاقی حالت کو ناپنے کے لئے ایسے انسان درکار ہیں جو یک طرفہ طور پر اپنے کو دوسروں کے لئے بے ضرر بنالیں۔ جو اپنے صابرانہ انداز کی وجہ سے اس بات کو ناممکن بنادیں کہ کوئی شخص ردعمل کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ ان کی زندگی اتنی بے داغ ہو کہ ان کے خلاف کیا ہوا ہر ظلم سراسر یک طرفہ ہو، ان کے خلاف برپا ہوا ہر فساد محض ایک فریق کی شرارت کا نتیجہ ہو۔

فرعون کے ظلم اور گھمنڈ کو ثابت شدہ بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت آسیہ جیسی معصوم خاتون اس کے عقد نکاح میں دی جائیں۔ وہ ان کی معصومیت کو پوری طرح دیکھے، اس کے باوجود بالکل بے بنیاد طور پر وہ ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ یہودیوں کی شیطنت کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مریم جیسی پاکیزہ روح درکار تھی جس کا معاملہ یہودیوں کے حوالے کیا جائے اور وہ اس کو ناحق ذلیل کریں اور اس پر زنا کا الزام لگائیں۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی سرکشی کو درجۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت خدیجہ جیسی بے داغ سیرت کی خاتون ان کے قبضہ میں دی جائیں اور وہ ان پر بلا سبب وحشیانہ سلوک کرکے انھیں موت کے کنارے پہنچادیں۔

یہ مصیبت جو خدا کے کچھ بندوں کو جھیلنی پڑتی ہے یہ اس عمل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ ترازو اسی وقت ترازو بنتا ہے جب کہ وہ تول کا بوجھ اٹھائے۔ یہی معاملہ انسانوں کے درمیان اخلاقی ترازو بننے کا بھی ہے۔ یہاں بھی آدمی کو "بوجھ" اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان خدا کی ترازو بن سکے۔ ظالم کے ظلم کو تولنے کے لئے ایک آدمی کو مظلومیت کا وار سہنا پڑتا ہے۔ مفسد کا مفسد ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص اس کے فساد کا شکار ہو۔ دھوکا دینے والے کے لئے کوئی آدمی درکار ہوتا ہے جو دھوکا کھا کر اس کی دھوکہ بازی کو ثابت شدہ بنائے۔ مزید یہ کہ ایسے ہر واقعہ میں قصور تمام تر ایک طرف ہو اور بے قصوری تمام تر دوسری طرف۔

بے داغ انسانوں کے ساتھ ظلم کیا جانا دراصل خدا کی سنت امتحان کی قیمت ہے۔ بے داغ انسان گویا خدا کے صحیح ترین ترازو ہیں جن پر لوگوں کی بدکرداریوں کو تولا جاتا ہے۔ لوگوں کے ایمان و اخلاق کو تولنے کی یہی واحد صورت ہے۔ یقیناً یہ بڑا اندوہناک معاملہ ہے۔ مگر ان ستائی ہوئی پاکیزہ روحوں کو خدا کل کے دن اتنا زیادہ اجر دے گا کہ وہ آج کی تمام [illegible]

[redacted]

کیا جائے گا۔ انس بن مالک فوراً کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا: امیرالمومنین، ہرمز صحیح کہتا ہے۔ آپ کہہ چکے ہیں کہ جب تک تم پانی نہ پی لوگے تم قتل نہ کئے جاؤ گے اور پانی اس نے پیا نہیں۔ حضرت عمر اگرچہ انس بن مالک کی دلیل سے مطمئن نہ تھے۔ مگر معاملہ کی نزاکت کی بنا پر خاموش ہو گئے۔

اب ہرمزان نے دوسری ہوشیاری یہ کی کہ کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان بن کر مدینہ میں رہنے لگا اور عمومی اسلامی قاعدہ کے مطابق دو ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ بھی بیت المال سے حاصل کر لیا۔

انھیں دنوں ایک ایرانی غلام ابولولو فیروز مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا۔ ہرمزان اور ابولولو فیروز دونوں مسلمانوں سے اس بات پر ناراض تھے کہ انھوں نے ایران کی کیانی عظمت کو مٹا دیا اور ان کے قومی فخر کا خاتمہ کر دیا۔ اس مشترک جذبہ نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ ان میں رازدارانہ باتیں ہونے لگیں۔ کیانی عظمت کو واپس لانے کے بارے میں وہ اپنے خواب کو واقعہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کی تخریب کے منصوبے بنانے لگے۔

جلد ہی اس کا ایک موقع انھیں میسر آگیا۔ ابولولو فیروز ایک روز مدینہ کے بازار میں تھا کہ اس کی ملاقات خلیفہ عمر سے ہو گئی۔ اس نے کہا اے امیرالمومنین، میرا آقا مغیرہ مجھ سے بہت زیادہ محصول لیتا ہے، آپ اس کو کم کرا دیجئے۔ حضرت عمر نے پوچھا کتنا۔ ابولولو نے کہا دو درہم روز۔ حضرت عمر نے کہا تم کیا کام کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ آہنگری، نقاشی اور نجاری۔ حضرت عمر نے کہا کہ جب تم اتنے ہنر جانتے ہو تو پھر یہ رقم تمھارے لئے زیادہ نہیں ہے۔ ابولولو کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ کیونکہ حضرت عمر نے مذکورہ معاملہ میں ابولولو کے بجائے مغیرہ بن شعبہ کی حمایت کی تھی۔

اس کے بعد حضرت عمر نے ابولولو سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ایسی چکی بنانا جانتے ہو جو ہوا کے زور سے چلتی ہے۔ تم مجھ کو بھی ایسی ایک چکی بنا دو۔ ابولولو نے جواب دیا کہ اچھا۔ میں آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کی آواز مشرق و مغرب کے لوگ سنیں گے۔

اب ہرمز اور ابولولو کے خواب کی تکمیل کا وقت آگیا۔ دونوں نے خفیہ سازش کر کے زہر میں بجھا ہوا ایک خنجر تیار کیا۔ اس کے بعد ابولولو ایک روز فجر کے وقت اندھیرے میں مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا۔ اس کی آستین میں مذکورہ خنجر چھپا ہوا تھا۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو وہ صف اول میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے امامت کے مقام پر کھڑے ہو کر نماز شروع کی تو ابولولو اچانک تیزی سے صف سے نکلا اور حضرت عمر پر پے بہ پے چھ وار کئے۔ حضرت عمر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعد کو اسی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اعلیٰ ظرفی

امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں روم کی مشرقی سلطنت کے اکثر حصے فتح ہو چکے تھے۔ رومی بادشاہ پسپا ہو کر قسطنطنیہ (ترکی) کے قلعہ میں رہنے لگا تھا۔ تاہم سرحد پر وہ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ اسی قسم کی ایک جھڑپ میں ایک بار رومیوں نے کچھ مسلمانوں کو قید کر لیا جن میں قریش کا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ رومی بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ وہ لوگ میرے سامنے حاضر کئے جائیں۔

مسلمان قیدی اس حال میں دربار میں لائے گئے کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی بادشاہ نے ان سے ذلت آمیز گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ تم جیسے لوگوں کی سزا یہی ہے۔ ہم تم کو اسی طرح سزا دیں گے یہاں تک کہ تم مر جاؤ اور تمہارے ہم قوموں کو عبرت ہو کہ وہ ہمارے علاقہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔

قریشی کو بادشاہ کا کلام سن کر غیرت آگئی۔ اس نے بادشاہ کو سخت انداز میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک تمہاری اسلام دشمنی باقی ہے تمہارے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔ اور تم جان لو کہ خدا کے راستہ میں ہمارا خون بہت سستا ہے مگر وہ اس وقت بہت قیمتی ہو جائے گا جب کہ تمہارے جیسا بادشاہ ہم کو قتل کرے۔

قریشی کا یہ جواب سن کر دربار کے ایک بطریق (Patriarch) کو غصہ آگیا۔ وہ اٹھ کر قریشی کے پاس آیا اور اس کے چہرہ پر دائیں بائیں دو طمانچہ مارا۔ قریشی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اپنی اس بے عزتی پر وہ چیخ پڑا:

وصاح القرشی باعلیٰ صوته۔ یامعاویة این انت لتنتقم من هٰؤلاء الانذال الذین لطموا شریفا من اهلك۔ والتفت الی البطریق وقال، اقسم باللّٰه ان لی معك یوما ستعرف فیه من انا۔

قریشی بلند آواز سے چیخا۔ اے معاویہ تم کہاں ہو کہ ان ذلیل لوگوں سے انتقام لو جنہوں نے تمہارے ایک شریف آدمی کو طمانچہ مارا ہے۔ پھر وہ بطریق کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میرا ایک دن آئے گا،

جب کہ تم جان لو گے کہ میں کون ہوں۔

اس واقعہ کی خبر قسطنطنیہ سے دمشق پہنچی۔ امیر معاویہ کو اسے سن کر بہت رنج ہوا۔ انھوں نے عزم کیا کہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے اولاً رومی بادشاہ سے تبادلہ کی بنیاد پر مسلمان قیدیوں کی رہائی کی بات کی۔ یہاں تک کہ مسلم قیدیوں کی تعداد کے مقابلہ میں رومی قیدیوں کی زیادہ تعداد کو واپس کر کے اپنے قیدیوں کو رہا کرالیا۔

اس کے بعد امیر معاویہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا۔ انھوں نے تلاش کر کے صور (شام) کے ایک آدمی کو حاصل کیا۔ وہ تاجر تھا اور رومی زبان جانتا تھا۔ امیر معاویہ نے کثیر مقدار میں اس کو سونے کے دینار دئے۔ اس کو پورا منصوبہ بتایا اور کہا کہ تم جاؤ اور کسی نہ کسی طرح اس بطریق کو پکڑ کر دمشق لے آؤ۔

اس آدمی نے تاجر کے روپ میں سفر کیا اور اس طرح دمشق سے قسطنطنیہ پہنچا۔ بطریق کے بارہ میں معلومات حاصل کر کے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اس کو قیمتی تحفے (عطر، جواہرات، ریشمی کپڑے وغیرہ) پیش کئے۔ اس طرح وہ کئی بار دمشق سے قسطنطنیہ اور قسطنطنیہ سے دمشق آتا جاتا رہا اور بطریق کو تحفے دیتا رہا۔ یہ پورا معاملہ اتنی رازداری کے ساتھ ہوا کہ تاجر اور امیر معاویہ کے سوا کسی اور کو اس کی مطلق خبر نہ ہو سکی۔

اس طرح لمبا عرصہ گزر گیا۔ جب بطریق سے کافی تعلقات ہو گئے تو اس نے بطور خود کچھ خاص تحفے لانے کی فرمائش کی۔ تاجر اس سے وعدہ کر کے واپس ہوا۔ وہ دمشق آیا۔ یہاں اس نے نہایت تیز رفتار اونٹنی حاصل کی۔ اونٹنی کو ایک آدمی کے ساتھ لاکر ایک خاص مقام پر ٹھہرایا۔ اس کے بعد وہ بطریق کے پاس گیا اور کہا کہ میں تمہارے تمام تحفے لے کر آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس طرح حیلہ کر کے وہ بطریق کو مذکورہ مقام پر لے گیا۔ یہاں دونوں نے اچانک بطریق کو پکڑ لیا۔ انھوں نے نہایت تیزی سے بطریق کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کو سواری پر بٹھا کر ہوا کی رفتار سے دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔

بطریق جب دمشق پہنچ گیا تو امیر معاویہ نے ایک مجلس میں بہت سے لوگوں کو جمع کیا اور مذکورہ قریشی کو بھی بلایا۔ اس کے بعد ایک پردہ ہٹایا گیا تو اس کے پیچھے مذکورہ بطریق موجود تھا۔ قریشی اس

کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ کے اگلے الفاظ یہ ہیں:

قال معاوية يخاطب القرشي يا ابن عمّ، الان تستطيع ان تشكر الصوري فقد نفذ كل تدبير دبرته له دون ان يخيب ظني في اقل شئ. والان تستطيع ان تاخذ حقك من البطريق دون ظلم له.

قال القرشي لولا اني اقسمت لعفوت عنه، ورفع يده ولطمه لطمة واحدة وهو يقول هذه تكفي، واعفو عنه فيما بقي.

ونظر معاوية الى البطريق، وقال: بعد هذا انت في ضيافتنا ثلاثة ايام

ومرت الايام الثلاثة فاعاده الصوري ومعه كل الهدايا التي كان قد طلبها

وفي قصر ملك الروم التف البطارقة حول الملك ليقول لهم لا تسيئوا الى اسرى المسلمين منذ الآن فما رأيت مثلهم عزة وكرامة واخلاقا. ولو اراد معاوية ان يخطفني لما عجز لكنه لا يرضى.

امیر معاویہ نے قریشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے، اب تم اس صوری تاجر کا شکریہ ادا کرو۔ اس کو میں نے جو تدبیر بھی بتائی اس کو اس نے بغیر کسی ادنیٰ کمی کے نافذ کیا۔ اور اب تم اس بطریق سے اس پر ظلم کئے بغیر اپنا حق لے سکتے ہو۔ قریشی نے کہا کہ اگر میں نے قسم نہ کھائی ہوتی تو میں اس کو معاف کر دیتا۔ پھر ہاتھ اٹھایا اور اس کو ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ بس یہ کافی ہے۔ بقیہ کو میں اس سے معاف کرتا ہوں۔ پھر معاویہ نے بطریق کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب تم تین دن کے لئے ہمارے مہمان ہو۔ تین دن گزرنے کے بعد اس کو صوری تاجر نے اس حال میں واپس کیا کہ اس کے ساتھ وہ تمام تحفے تھے جن کو اس نے طلب کیا تھا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ میں تمام بطریق رومی بادشاہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اب مسلم قیدیوں کے ساتھ برا سلوک نہ کرو۔ کیوں کہ میں نے عزت اور شرافت اور اخلاق میں ان کے جیسا نہیں دیکھا۔ اور اگر معاویہ مجھ کو پکڑنا چاہتے تو وہ اس کے لئے عاجز نہ تھے مگر انھوں نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔

الدعوة (مكة) ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

علامتی سرزمین

شارلی مان (۸۱۴ - ۷۴۲ء) عباسی خلیفہ ہارون رشید کا ہم عصر تھا۔ مغربی یورپ کے بڑے حصہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ ہارون رشید کے زمانہ حکومت (۸۰۹ - ۷۸۶ء) میں ایسا ہوا کہ خلیفہ اور فرینک شہنشاہ شارلی مان کے درمیان بعض سفارتی تبادلے ہوئے۔ اس میں بظاہر شارلی مان کا مقصد یہ تھا کہ لاتینی اہل کلیسا کے لیے یروشلم میں کچھ مراعات حاصل کی جائیں:

> It was in Harun's reign that certain diplomatic exchanges took place between the caliph and the Frankish emperor Charlemagne.

پروفیسر ہٹی نے بعض مسیحی ماخذ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خلیفہ بغداد کی طرف سے اس وقت شارلیمان کے لیے جو قیمتی تحفے بھیجے گیے، ان میں ایک پیچیدہ گھڑی (Intricate clock) بھی شامل تھی۔ (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۲۹۸)

۱۲ سو سال پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ یورپ کے بادشاہ کو وقت کا وہ اعلیٰ تحفہ بھیج سکتے تھے جو خود یورپ میں ناقابل حصول تھا۔ اور یورپ کا مسیحی بادشاہ فلسطین میں اپنے ہم مذہبوں کے حق میں معمولی مراعات حاصل کرنے کے لیے مسلم خلیفہ سے رجوع کرتا تھا، آج یہ حال ہے کہ اسی فلسطین میں مسلمانوں کی خود اپنی جان و مال بھی محفوظ نہیں۔

فلسطین کے قدیم وارثوں (یہود) کے لیے یہ قانون تھا کہ اگر وہ خدا کے دین پر قائم رہیں تو انھیں فلسطین میں باعزت زندگی حاصل ہو۔ اور اگر وہ خدا کے دین سے ہٹ جائیں تو خدا کافر قوموں کے ذریعہ انھیں فلسطین میں ذلیل کردے (بنی اسرائیل ۸) فلسطین اپنے قدیم وارثوں کے لیے خدا کے رحمت اور غضب دونوں کی علامت تھا۔ اسی طرح فلسطین اپنے نئے وارثوں (مسلمانوں) کے لیے بھی خدا کے رحمت اور غضب کی علامت ہے۔ مسلمان اگر خدا کے دین پر قائم ہوں تو وہ فلسطین میں عزت پائیں گے۔ اور اگر وہ خدا کے دین پر قائم نہ رہیں تو اندیشہ ہے کہ فلسطین میں ان کا وہی انجام ہو جو اس کے سابق وارثوں کا اس بابرکت زمین میں ہوا۔

تعمیر سیاست

ابوعلی محمد بن علی بن مُقلہ (۳۲۸ ـ ۲۷۲ھ) نہایت اعلیٰ صلاحیت والا آدمی تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیت سے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں مجتہدانہ اصلاحات کیں۔ اور اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے عربی خط کو ابتدائی دور سے نکال کر تکمیلی دور میں پہنچا دیا۔ فلپ کے ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں اس کو عربی فن کتابت کا بانی (Founder of Arabic Calligraphy) کہا ہے (صفحہ ۴۶۸)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ ابن مقلہ ۸۸۶ء میں بغداد میں پیدا ہوا، اور ۹۴۰ء میں بغداد ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ عباسی دور (۱۲۵۸ ـ ۷۵۰) کا ممتاز ترین خطاط تھا۔ اس نے عربی خط کو کوفی خط کے دور سے نکال کر نسخی خط کے دور میں پہنچایا۔ اس طرح اس نے عربی خط کو نیا حسن (Beauty) عطا کیا۔ (V/272)

ابن مقلہ ابتداءً بغداد میں عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ ـ ۲۸۲ھ) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ ـ ھ) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ ـ ۲۹۷ھ) کا۔

واضح ہو کہ ”وزیر“ قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسیٰ الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے :

اعجب من کل ما رأینا ان وزیرین فی بلاد
سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط

بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتاب کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔

مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوئی ٹی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۷۵۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔

اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۸۸۵ء — ۹۴۰) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں، شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں وہ اس کو مل چکی ہوتیں۔ ابن مقلہ ہزار سال پہلے دنیا کو دور پریس میں داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو اپنے مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لیے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی برباد ہوا، اور ملت بھی اس قیمتی فائدہ سے محروم رہ گئی جو اس کی خداداد صلاحیت کے ذریعہ ملت کو پہنچ سکتا تھا۔

ابن مُقلہ جب وزیر (یا وزیر اعظم) کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے لیے صحیح ترین بات یہ تھی کہ وہ اس اعلیٰ موقع کو تعمیری میدان میں استعمال کرے۔ مگر وہ حب جاہ کی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گیا جس میں اکثر وہ لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی اور تعمیری حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش خدمت میں مشغول رہنے کے بجائے اب وہ خفیہ قسم کی سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا۔ اب اس نے چاہا کہ حکومت کے نظام میں اپنے مفید مطلب انقلاب لائے۔ اس نے ایک خفیہ منصوبہ کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا تاج پہنایا جائے۔

کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبّك الشيئ يُعمى و يُصم) ابن مقلہ بھی اپنی ساری ذہانت کے باوجود اسی کمزوری کا شکار ہوا۔ وہ اپنے حالات کا اور اس کے مقابلہ میں خلیفہ کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ چنانچہ راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لیے مسائل پیدا کیے۔ یہاں تک کی راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا، اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش   یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔ (ہٹی، صفحہ ۴۲۴)

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کیے۔ وہ کہتا تھا:

وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہؐ کی فلاں فلاں حدیثوں کی کتابت کی، جس نے مشرق اور مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے، وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔

مگر اس دنیا میں اس قسم کے جذباتی الفاظ کی کوئی قیمت نہیں۔ ابن مقلہ کی غلطی یہ تھی کہ وہ قرآن اور حدیث لکھنے ہی پر نہیں رکا، اس نے حد سے نکل کر ایسے مقام پر اپنا ہاتھ ڈال دیا جو اس کا مقام نہ تھا۔ اور جو شخص اس طرح حد سے نکل جائے، اُس کا اِس دنیا میں یہی انجام ہوتا ہے۔

ابن مقلہ مر گیا مگر اس کا کردار آج بھی زندہ ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ ہیں جو عین ابن مقلہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنے ملے ہوئے مواقع کو تعمیر ملت کی بجائے ذاتی جاہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ملت کی تاریخ تعمیر کی تاریخ بننے کے بجائے تخریب کی تاریخ بن رہی ہے۔

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کرسکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جدوجہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں، ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا (المومن لا یلدغ من جحر مرتین)

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین صلاحیتیں ہمیشہ سیاسی عزائم میں برباد ہوئی ہیں۔ سیاست بازی کے کام میں عام طور پر وہی لوگ حصہ لیتے ہیں جو قدرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کو کسی تعمیری خدمت میں لگانے کے بجائے سیاسی حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ بے شمار اقتصادی وسائل برباد ہوتے ہیں۔ اور عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو لیڈرانہ شہرت حاصل ہو جائے اور عوام کے حصہ میں صرف یہ نتیجہ آئے کہ ایک "ظالم" کی جگہ دوسرا "ظالم" تخت سلطنت پر بیٹھ گیا ہو۔

تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے کہ مقابلہ آرائی کی سیاست سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہوا ہو۔ قوم کو اٹھانے کا راز یہ ہے کہ قوم کے رہنما اپنے سیاسی جھنڈے کو نیچا کر لیں۔ انفرادی حوصلوں کا "بیج" جہاں زمین میں دفن ہوتا ہے وہیں سے قومی مستقبل کا شاندار "درخت" اگتا ہے۔ آج ہماری تاریخ کو اسی قسم کی نفسیاتی شہادت کا انتظار ہے نہ کہ جسمانی قتل اور ہلاکت کا۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم ہیں جو ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے "امام" مقرر ہوئے — ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چارجامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا"۔ خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جاکر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور بآسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت، تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا، مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکایک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہونے سے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوئے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

الفاظ کا فتنہ

ابو الطیب احمد بن حسین عرف متنبی (۳۰۳-۳۵۴ھ) کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس بنا پر امیر حمص نے اس کو قید خانہ میں بند کر دیا تھا۔ دوسرا طبقہ اس کا منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ متنبی کے دل میں کبھی اس کا ارادہ پیدا ہو مگر اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔

متنبی ایک ذہین اور باکمال شاعر تھا۔ اس کا کچھ کلام کتابوں میں نقل ہوا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کے جواب میں کہا تھا مثلاً:

النجم السیار و الفلك الدوار واللیل و النهار
ان الکافر لفی اخطار

جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کلام اتنا سطحی ہے کہ کوئی جاہل یا غبی آدمی ہی اس کو قرآن کے مقابلہ میں رکھ سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ متنبی سے پوچھا گیا کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ کیوں کہ آپ نے تو صاف طور پر کہا ہے کہ لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اس نے کہا کہ تم لوگوں نے اس حدیث کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حدیث میں تو میری نبوت کی بشارت ہے۔ اس میں لا حرف نفی نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "لا" نام کا نبی میرے بعد ہوگا۔ کیوں کہ آسمانوں پر میرا نام "لا" ہے۔

ایک برطانی شہری کو کسٹم والوں نے پکڑا۔ وہ اپنے جوتے میں ۵۹۸ ملی گرام ہیروئن لئے ہوئے تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جون ۱۹۸۴) سوالات کے دوران اس نے کہا کہ اس نے صرف اس لئے ایسا کیا تھا کہ اپنی عادت کو ٹھوکر مار کر پھینک دے۔

He was only trying to kick the habit.

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظی تاویل کا میدان کتنا زیادہ وسیع ہے۔ لفظی تاویل ایک ایسا ہتھیار ہے جو سفید کو سیاہ کر دے۔ جو قائل کے کلام سے اس کے منشا کے برعکس مفہوم ثابت کر دے۔ لفظی تاویل آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ ہر بات سے اپنا نظریہ نکال لے۔ خواہ وہ بات اصلاً اس کے نظریے کے بالکل برعکس مفہوم کیوں نہ رکھتی ہو۔ آدمی حقیقت کی تردید الفاظ کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

دوقسم کے انسان

امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) خلیفہ ہارون الرشید کے ہم زمانہ تھے۔ وہ حصول علم کے لئے مکہ آئے۔ یہاں انھوں نے سفیان بن عُیینہ اور دوسرے محدثین سے استفادہ کیا۔

اس زمانہ میں امام شافعی بہت سخت معاشی حالات میں تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں یمن کا والی مکہ آیا۔ قریش کے بعض ممتاز افراد نے والی یمن سے سفارش کی کہ شافعی کے اندر اہلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے۔ والی یمن نے اس سفارش کو قبول کرتے ہوئے انھیں نجران کا عامل بنا دیا۔

مگر امام شافعی کی غیر مصالحت پسندانہ طبیعت نے اس کے بعد ان کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ مذکورہ والی یمن ایک ظالم آدمی تھا۔ امام شافعی نے بعض مواقع پر اس کو اس کی زیادتی اور بے انصافی پر ٹوکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ امام شافعی کا مخالف ہوگیا۔ وہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنے لگا جس کے واسطے سے وہ ان کو سزا دے سکے۔

بالآخر ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے امام شافعی کے اندر ایسے سیاسی "عقائد دریافت کر لیے جن کا ذکر کرکے خلیفہ وقت کو ان کے خلاف مشتعل کیا جا سکے۔ چنانچہ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو خط میں لکھا کہ ـــــ شافعی علوی سادات کے ساتھیوں میں سے ہے۔ علوی سادات وہ لوگ تھے جن پر یہ الزام تھا کہ وہ عباسیوں کی حکومت کے خلاف ہیں۔ ہارون الرشید نے یہ سنا تو اس نے سمجھا کہ شافعی کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اس نے بگڑ کر والی یمن کو خط لکھوایا کہ شافعی کو اس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ فوراً دارالخلافہ (بغداد) روانہ کرو۔ اس حکم کے مطابق امام شافعی کو گرفتار کرکے بغداد بھیج دیا گیا۔

یہ بہت نازک معاملہ تھا۔ مگر اس زمانہ میں امام محمد بغداد میں موجود تھے۔ وہ خلیفہ کے قابل اعتماد لوگوں میں تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعی ایک مجرم کے طور پر خلیفہ کے دربار میں لائے گئے ہیں تو وہ فوراً دربار میں پہنچے۔ انھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ وہ ایک دیندار اور علمی آدمی ہیں۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ امام محمد کی سفارش پر امام شافعی رہا کر دئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۰۴ھ کا ہے جب کہ ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔ ابھی وہ صرف "شافعی" تھے، اس وقت تک وہ "امام شافعی" نہیں بنے تھے۔ اس مثال میں ایک کردار والی یمن کا ہے اور دوسرا امام محمد کا۔ والی یمن نے پست اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور امام محمد نے اعلیٰ اخلاق کا نمونہ۔

غلط فہمی

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری (۹۲۳ - ۸۳۹ء) مشہور عالم ہیں۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک میں تحصیل علم کے بعد بغداد میں مقیم ہوگیے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی کتابوں میں سے دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر میں جامع البیان عن تاویل آی القرآن، اور تاریخ میں تاریخ الامم والملوک۔ دولت سامانیہ کے شہزادہ منصور بن نوح نے ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کی تاریخ کی کتاب کا فارسی ترجمہ (۹۶۳ء) تیار کرایا تھا۔

ابن جریر طبری مسلمہ طور پر ایک عظیم اسلامی عالم تھے۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ اقوام وملوک کی تاریخ پر ان کی مشہور کتاب ہے، اور تفسیر قرآن پر ایک کتاب ہے جس کے مثل کتاب ابھی تک کسی نے نہیں لکھی (ولہ الکتاب المشهور فی تاریخ الامم والملوك وكتاب فی التفسیر ولم یصنف احد مثلہ) مگر ۲۸ شوال ۳۱۰ھ کو جب ابن جریر طبری کا بغداد میں انتقال ہوا تو حنبلی علمار کی شدید مخالفت کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے عام قبرستان میں جگہ نہیں ملی۔ انتقال کے اگلے روز وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کر دیئے گیے۔

امام محمد بن جریر طبری کا یہ انجام کیوں ہوا۔ اس کی وجہ ایک بدگمانی تھی جو بلا تحقیق ان کی طرف منسوب کر دی گئی اور بڑھتے بڑھتے اپنی آخری حد پر پہونچ گئی۔ اصل یہ ہے کہ اسی زمانہ میں ایران میں ایک اور صاحب تھے جن کا نام محمد بن جریر بن رستم ابوجعفر الطبری تھا۔ یہ شیعہ عالم تھے۔ شیعی مسلک کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا ضروری نہیں ہے۔ صرف مسح بھی کافی ہے۔ نام کے جزئی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کو ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کا مسلک سمجھ لیا، حالانکہ وہ محمد بن جریر بن رستم ابوجعفر الطبری کا مسلک تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر متشدد علمار (مثلاً ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری) نے ان کو رافضی کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ امام ابن جریر طبری کا رفض اور شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

معاشی فراغت

محمد بن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ ھ) ایک انتہائی مشہور عالم ہیں۔ وہ طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کی تحصیل کے لئے رے، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، بغداد وغیرہ کے سفر کئے۔ اپنی پوری عمر تحقیق اور تصنیف میں گزار دی۔ ان کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے:

قيل انه كان يكتب كل يوم ٤٠ صفحة ويتحيرون متى ينام ومتى ياكل ويصلى وذالك لكثرة ماصنفه فى التاريخ والفقه والحديث والتفسير والقرأت وعلم الحساب

کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ چالیس صفحات لکھتے تھے اور لوگ حیرت کرتے تھے کہ وہ کب سوتے ہیں اور کب کھاتے ہیں اور کب نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، قرأت اور علم حساب میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی کتاب ۳۰ جلدوں میں ہے اور قرآن کے مطالعہ کے لئے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب تاریخ الرسل والملوک اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ عربی اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ ابن جریر طبری کی فارسی دانی ان کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے فارسی مصادر سے معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیں۔

ابن جریر طبری نے اپنی زندگی کو علم کے لئے وقف کیا اور اہم ترین کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی وجہ ان کی معاشی فراغت تھی:

كان والد الطبري يملك مقاطعة فى طبرستان فنشأ ابن جرير غير محتاج لكسب۔ اذ كان والده ينفق عليه واستمر هذا الانفاق يؤدى اليه حتى بعد وفاة ابيه وهو ينتقل بين البلاد

ابن جریر طبری کے والد کی طبرستان میں ایک جائداد تھی۔ اس کی وجہ سے ابن جریر نے کمانے کی محتاجی کے بغیر نشو ونما پائی۔ ان کے والد ان کا خرچ دیتے رہتے تھے۔ یہ معاملہ والد کی وفات کے بعد بھی باقی تھا۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے رہتے اور ان کا خرچ انھیں ملتا رہتا۔

کوئی موثر کام کرنے کے لئے معاشی فراغت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دینی کام کے لئے بھی ہے اور دنیوی کام کے لئے بھی۔

نازک مسئلہ

خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان پر کچھ شورش پسند مسلمانوں نے قاتلانہ حملہ کیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو انھیں شہید کر ڈالا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ آپ کی مدت خلافت ۱۲ سال ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ اس وقت حج کی ادائگی کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ مقام سرف تک پہونچی تھیں کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ راستہ ہی سے مکہ کی طرف واپس روانہ ہوگئیں۔ مکہ پہونچیں تو ان کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپ کی سواری کے گرد جمع ہوگیے۔ حضرت عائشہ نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ خدا کی قسم، عثمان مظلوم مارے گیے۔ خدا کی قسم، میں ان کے خون کا بدلہ لوں گی (قتل واللہ عثمان مظلوما واللہ لاطلبن بدمہ، العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۷۲۱)

حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہوکر مکہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ مکہ اور اطراف مکہ میں منادی کر دی گئی کہ ام المومنین عائشہ بصرہ جا رہی ہیں۔ جو شخص اسلام کا حامی ہو اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہے، وہ قافلہ میں شریک ہو جائے۔

مکہ سے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا لشکر روانہ ہوا۔ باہر نکلے تو اطراف و جوانب سے لوگ جوق در جوق آکر قافلہ میں شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی اس لشکر کی تعداد تین ہزار ہوگئی۔

یہ لوگ چلتے ہوئے ایک مقام پر پہونچے جہاں ایک چشمہ تھا۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کو دیکھ کر وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہ نے یہ منظر دیکھ کر چشمہ کا نام پوچھا۔ بتایا گیا کہ یہ حواب کا چشمہ ہے۔ یہ نام سنتے ہی حضرت عائشہ نے کہا کہ مجھ کو لوٹاؤ۔

لوگوں نے سبب دریافت کیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی بیویاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ آپ نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم میں سے کس کو دیکھ کر حواب کے کتے بھونکیں گے۔ یہ کہہ کر حضرت عائشہ نے اونٹ کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اونٹ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ ایک دن اور ایک رات وہیں مقیم رہیں۔ تمام لشکر بھی آپ کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہا۔

اس کے بعد کچھ لوگوں نے منصوبہ بنا کر اچانک شور کر دیا کہ جلدی کرو، جلدی کرو۔ علی تم تک پہنچ گیے۔ یہ سن کر تمام لشکر نہایت عجلت کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ کے اونٹ کو بھی تیزی سے اٹھا کر بھیڑ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت عائشہ کے سوال پر انھیں بتایا گیا کہ کسی نے غلطی سے آپ کو اس چشمہ کا نام مواُب بتا دیا تھا۔ درحقیقت یہ چشمہ وہ چشمہ نہیں ہے۔ اور نہ مواُب کا چشمہ اس راستہ میں آتا ہے۔

یہ لوگ چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ بصرہ کے قریب پہونچ گیے جہاں خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب مقیم تھے۔ یہیں وہ جنگ پیش آئی جو اسلامی تاریخ میں جنگ جمل (۳۶ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں خود مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ ایک گروہ کے قائد حضرت علی تھے جن کے ہاتھ پر حضرت عثمان کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی تھی۔ دوسری طرف حضرت عائشہ تھیں جو خون عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر وہاں پہنچی تھیں، کیوں کہ انھیں یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ حضرت علی خون عثمان کے معاملہ کو دبا رہے ہیں اور قاتلینِ عثمان سے انتقام لینے پر تیار نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑ گیا۔

جنگ جمل کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ بوقت مقابلہ حضرت عائشہ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تقریباً ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف حضرت علی کی فوج کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت عائشہ کے لشکر میں سے ۹ ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گیے۔ اور حضرت علی کی فوج میں سے ایک ہزار ستّر آدمی کام آئے۔ گویا مجموعی طور پر تقریباً دس ہزار مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگیے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ عوامی تحریک اٹھانا جتنا آسان ہے، اس کو کنٹرول کرنا اتنا آسان نہیں۔ خواہ اس کی قیادت ام المومنین جیسی مقدس ہستی کیوں نہ کر رہی ہو۔ جو لوگ جذباتی اشو پر پرجوش تقریریں کر کے بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے ہیں اور عوام کی بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ آغاز سے زیادہ انجام پر غور کریں۔

اس قسم کی عوامی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں لیڈر نمبر ۱ پر ہوتا ہے

اور عوام نمبر ۲ پر۔ مگر جب جوش و جذبہ میں بھرے ہوئے عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو چکی ہو تو اس کے بعد صورت حال یکسر بدل جاتی ہے۔ اب عوام کو نمبر ۱ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور لیڈر نمبر ۲ کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اب تحریک کی رہنمائی کے لیے عملی طور پر صرف عوام کا جوش رہ جاتا ہے نہ کہ رہنماؤں کا ہوش۔

ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے عوامی کام کو بہت زیادہ سوچ سمجھ کر شروع کیا جائے۔ کیوں کہ اس قسم کے کام کو شروع کرنا ہمیشہ انتہائی آسان ہوتا ہے، مگر اس کو نیک انجام تک پہونچانا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ حضرت عائشہ اگر حج کے بعد گھر (مدینہ) واپس جانے کا فیصلہ کرتیں تو یہ ان کے لیے بالکل سادہ اور آسان سی بات ہوتی۔ مگر حواُب کے چشمہ پر جب کہ وہ بھیڑ کے درمیان تھیں تو یہی سادہ سی بات ان کے لیے ناممکن کے درجہ میں مشکل ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہنگامی مواقع پر بیچ سے رائے بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں میں بیچ سے رائے بدلنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دریا کو چھلانگ کے ذریعہ پار کرنا چاہے، اور جب وہ اس کے درمیان میں پہونچے تو یہ فیصلہ کرے کہ مزید تیاری کے لیے اس کو پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔

یہ صحیح نہیں

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے مقالہ کروسیڈ (Crusades) کے تحت لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسیحی مبلغین مشرق کے مسلم ممالک میں داخل ہوئے۔ تاہم وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلامی قانون چوں کہ نہایت سختی کے ساتھ غیر مذاہب کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اسلام سے پھر جانے والے کے لیے اس کے یہاں موت کی سزا ہے، اس لیے اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہی:

> Since Islamic law rigidly prohibited propaganda and punished apostasy with death, conversion from Islam were few (5/310).

یہ صحیح ہے کہ اسلامی دور میں غیر مذاہب کی تبلیغ موثر انداز میں جاری نہ رہ سکی۔ مگر اس کی وجہ قانونی ممانعت نہ تھی۔ اس کی وجہ تمام تر وہی تھی جو موجودہ زمانہ میں ہم نسلی بادشاہت کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ آزاد ممالک (مثلاً ہندستان یا فرانس میں) نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ پر کوئی قانونی پابندی نہیں۔ اس کے باوجود ان ملکوں میں نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کے فکری انقلاب نے نسلی بادشاہت کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ نسلی بادشاہت علمی طور پر اب اس قابل نہیں کہ کوئی اس کا مبلغ بن سکے۔

اسی طرح مسلمانوں کے عیسائی نہ ہونے کا کوئی تعلق اسلام کے قانونِ ارتداد سے نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قسم کے اندیشہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ مگر سابقہ صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی تقریباً تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے عملاً ارتداد کا راستہ کھلا ہوا ہے، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں مسیحی مبلغین کو کہیں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی صداقت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے اوپر دوسرے مذاہب کی تبلیغ کو غیر موثر بنا رہی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کی نظریاتی طاقت سے ہے نہ کہ تبلیغ کی قانونی ممانعت سے۔

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد نے رجب۔ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) میں اسپین کو فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ طارق جب آبنائے جبرالٹر کے ذریعہ سمندر کو پار کرکے اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی فوج کو اسپینیوں سے جنگ پر اکساتے ہوئے کہا:

اين المفر۔ البحر من ورائكم والعدو
امامكم۔ فليس لكم والله الا الصدق
والصبر

اب بھاگنے کی جگہ کہاں۔ سمندر تمہارے پیچھے
ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے۔ خدا کی قسم اب
تمہارے لئے صدق اور صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

حقائق کا گہرا تجزیہ بتاتا ہے کہ کشتیوں کو جلانے کا یہ قصہ محض داستان گو قسم کے لوگوں کی ایجاد ہے، وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ ایک عرب مصنف نے لکھا ہے کہ اسپین میں ایک مثل ہے کہ میں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں (احرقتُ کل سُفُنی) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت خرچ کر دی۔ یعنی جنگ کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ (ای بذلت کل طاقتی، بمعنی قاتلوا او موتوا) ممکن ہے کہ یہی اسپینی مثل عربی میں ترجمہ ہوئی ہو، اور پھر کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنی میں لے کر بطور خود کشتیوں کو جلانے کا افسانہ گھڑ لیا ہو۔

طارق بن زیاد کا قافلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں اسپین میں داخل ہوا ہے۔ اس زمانہ کی معاصر تاریخ میں یا کسی بھی قریبی زمانہ کی تاریخی دستاویز میں کشتیوں کے جلانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ابتدائی دور کی تمام کتابیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ قصہ پہلی بار ان کتابوں میں ملتا ہے جو اصل واقعہ کے ساڑھے چار سو سال بعد چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر معاصر مورخین کو یا قریبی زمانہ کے تاریخ دانوں کو نہ ہو سکی، اس کی خبر سیکڑوں سال بعد کے مصنفین کو کیسے ہو گئی۔

طارق بن زیاد کے فتح اسپین (۹۲ھ) کے بارہ میں قدیم ترین ماخذ دو کتابوں کو مانا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں احراق سُفُن (کشتیاں جلانے) کا مطلق کوئی ذکر نہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

تاریخ افتتاح الاندلس ، ابن القوطیہ ، م ۳۶۷ھ

اخبار مجموعہ ، مصنف کا نام لامعلوم ، یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان کے علاوہ چوتھی صدی ہجری میں کئی مشہور مسلم مورخ گزرے ہیں۔ مثلاً ابن عبد الحکم (فتوح مصر والمغرب والاندلس) عبد الملک بن حبیب (مبتدأ خلق الدنیا) ابوبکر محمد القرطبی (تاریخ افتتاح الاندلس) احمد بن محمد، ابن الفرضی (تاریخ علماء الاندلس) الخشنی (قضاۃ قرطبہ) وغیرہ۔ ان مورخین کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد اپنی کشتیوں کو آگ لگادی تھی۔ حتی کہ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون تک کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔

احراق سُفُن (کشتیوں کو جلانے) کا واقعہ پہلی بار چھٹی صدی ہجری میں بیان کیا گیا۔ ابومروان عبد الملک بن الکردبوس چھٹی صدی ہجری کا ایک مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب تاریخ الاندلس میں اس قصہ کو درج کیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ قصہ اس کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا۔ اس لئے آج ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کے ماخذ کی تحقیق کریں۔

دوسرا شخص جس نے ابتداءً اس قصہ کو بیان کیا وہ بھی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ ابوعبداللہ محمد الادریسی (م ۵۶۰ھ) ہے۔ اس نے نزہۃ المشتاق کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں احراق سفن کا قصہ درج کیا۔ مگر اس نے بھی اس کا کوئی ذریعہ نہیں بتایا۔ انھیں دونوں کتابوں سے لے کر دوسرے لوگوں نے اس قصہ کو نقل کرنا شروع کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو واقعہ لوگوں کو ساڑھے چار سو سال تک معلوم نہ تھا، وہ ساڑھے چار سو سال بعد کس طرح لوگوں کے علم میں آگیا۔ ایسی حالت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصہ سراسر فرضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دانش مند جنرل ایسا نہیں کرسکتا۔ اسپین میں قیام کے دوران طارق کا اتصال افریقہ (مغرب) سے برابر جاری رہا۔ اگر کشتیاں جلادی جاتیں تو یہ اتصال کیوں کر ممکن ہوتا۔ طارق نے اسپین کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر (مقیم افریقہ) سے مدد طلب کی۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار مزید فوجی بطور امداد روانہ کئے۔ یہ پیغام رسانی اور سمندر میں لشکر کی منتقلی کشتیوں کے بغیر کیسے ممکن ہوئی۔

تاریخی تفصیلات

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو، ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک ”مورخ اسلام“ لکھتے ہیں:

> ”اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔“

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتی وجود میں نہیں آئی تھی جس پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کرکے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴۱۵ء میں قوط (Visigoths) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ گاتھ

کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کر کے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (فیطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (Radrick) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کر دیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کر کے مسلمانوں کے قریب کر دیا جو افریقی برِّ اعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہو گیا اور جبری طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دے دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کر لے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ ھ کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا: "مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو۔"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر

پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کرکے دوبارہ واپس آگئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کرکے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح کی داستانوں میں اس قسم کے افسانے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی قدیم کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کرکے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایها الناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم
والله الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے۔ تمہارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور جم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکری چیخ اٹھے:

انا وراءك يا طارق   طارق ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمہارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جاچکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر

اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلعۃ الاسد (Lion's rock) تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکھٹا ہو گئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (Pamplona) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جاسکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہو گئے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں

کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۹۰ - ۸۸ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شمرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

> "رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہوگیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ کی دعوت پر ہوا تھا نہ کہ محض اپنی تحریک پر۔ ۷۰۹ء میں وٹیزا (Witiza) کی موت سے اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں رذریق کے مقابلہ میں وٹیزا کے خاندان نے موسیٰ بن نصیر سے مدد چاہی۔ اس کے بعد طارق ۷۱۱ء میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں اترے اور رذریق کو فیصلہ کن شکست دی۔

اس کے بعد تعجب خیز طور پر اکثر اسپینیوں نے رضا کارانہ طور پر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۲۰ ہزار کی ایک فوج کے ہاتھوں اس تیز رفتار فتح کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس وقت اسپین کے لوگوں میں

اتحاد نہ تھا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں سے اسپین کے لوگوں کو بہت فائدے پہنچے۔ مثلاً نئے حکمرانوں نے ان کے اوپر سے ٹیکس کا بوجھ کم کر دیا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوگئی۔ یہود پر عیسائیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم ختم ہوگئے اور انھیں سماج کے اندر برابری کا درجہ مل گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصہ میں مسلم اسپین کے اندر ایک نیا اور بالکل مختلف سماج قائم ہوگیا (17/414)

نتیجۂ بحث

تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ حقائق حیات کا مطالعہ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی مہلک گولیاں تیار ہوتی ہوں —— حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں طارق بن زیاد کی کامیابی ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ تھی نہ کہ محض پرجوش اقدام کا نتیجہ۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت اٹل اصولوں پر قائم ہے جن کو پوری طرح سمجھا اور جانا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی واقعہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ ان قوانین کے ساتھ مطابقت کر کے عمل کیا جائے جن پر موجودہ دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں کو جانے اور ان کے اوپر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں، خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارہ میں کتنا ہی زیادہ خوش فہم ہو اور اپنی مفروضہ کامیابی کو بتانے کے لئے اس نے کتنے ہی زیادہ شاندار الفاظ پا لئے ہوں۔

میوات کا سفر از مولانا وحید الدین خاں
صفحات
ہدیہ ۲۵ روپیہ

یونانی علوم

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) قدیم یونان کا بادشاہ تھا۔ اس نے ایران سے لے کر ترکستان اور چین تک بہت سے ممالک فتح کر ڈالے۔ اس کے بعد رومی ابھرے اور انھوں نے دوسرے ملکوں کے ساتھ یونان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب دونوں سلطنتیں ایک ہو گئیں۔ اس طرح یونانیوں اور رومیوں نے اسلام سے پہلے قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ سیاسی کامیابیوں نے قوم کے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ ان کی بڑھتی ہوئی خوشحالی نے انھیں علمی کام کے مواقع دیئے۔ ان حالات میں یونان میں فلسفہ اور دوسرے علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم یہ فلسفہ زیادہ تر منطقی بحثوں اور دور از کار قیاس آرائیوں پر مشتمل تھا۔ قسطنطین کے بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو اس قسم کی کتابوں کو مذہب کے لیے مضر سمجھ کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کو فلسفیانہ کتابوں کی تلاش ہوئی تو اس نے شاہ روم کو خط لکھا کہ فلسفہ کے متعلق یونانی اور رومی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے ان کو بھیج دے۔ اس زمانہ کا رومی بادشاہ خود بھی اس قسم کی کتابوں سے بے خبر تھا۔ اس نے معلومات کیں تو ایک بوڑھے راہب نے اس کو ایک بند مکان کا پتہ دیا جہاں عیسائیت کے فروغ کے بعد فلسفہ کی تمام کتابیں لوگوں سے چھین کر رکھ دی گئی تھیں اور باہر سے اس پر بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا۔ شاہ روم نے راہب سے پوچھا، کیا یہ کتابیں مسلمانوں کے ملک میں بھیج دی جائیں۔ راہب نے جواب دیا: آپ ضرور ان کو مسلمانوں کے پاس بھیج دیں۔ کیوں کہ یہ کتابیں جس قوم میں پڑھی جائیں گی اس کو لایعنی بحثوں میں الجھا کر اس کے عقائد کو متزلزل کر دیں گی اور نتیجۃً اس قوم کی کمزوری کا باعث ہوں گی۔ چنانچہ شاہ روم نے یہ کتابیں اس مکان سے نکالیں اور ان کو پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے:

ان کو اس گھر میں بہت سی کتابیں ملیں۔	ووجد وافیہ کتبا کثیرۃ فاخذوا
انھوں نے کسی تحقیق وجستجو کے بغیر ایک طرف	من جانبھا بغیر علم وفحص خمسۃ

احمال وسیرت الی المامون سے پانچ بوجھ کے بقدر کتابیں لیں اور ان کو مامون کے پاس بھیج دیا۔

(اخبار الحکماء)

عیسائی راہب کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں اس قسم کی کتابوں کے اثر سے مسلمان قرآن کے فطری اسلوب سے ہٹ گیے۔ قرآن میں استدلال کی بنیاد حقائق فطرت پر رکھی گئی تھی، قدیم فلسفیانہ کتابوں سے متاثر ہوکر مسلمانوں نے استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ دی۔ یہ طریق بحث اور طرز استدلال سراسر قرآن سے ہٹا ہوا تھا۔ مگر بعد کو وہ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہوکر دھیرے دھیرے مقدس بن گیا۔ اس واقعہ کو اب ایک ہزار سال سے زیادہ ہورہے ہیں مگر آج بھی مسلمان منطق و فلسفہ کے اس طلسم سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اس غیر اسلامی علم کے ابدی تسلط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں کے بعد مسلمانوں کے جو علوم مدون ہوئے وہ تمام تر اسی منطقی اسلوب میں مدون ہوئے۔ یہ طرز ہمارے علوم میں اتنا زیادہ دخیل ہوا کہ اب ایک شخص جو قدیم منطق میں کافی درک نہ رکھتا ہو وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً شرح ملاّ علم نحو کی کتاب ہے اور ہمارے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر منطق کی اصطلاحات اور منطقی طرز بحث کو جانے بغیر اس کتاب کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی حال فنون اسلامی کی دوسری کتابوں کا ہے۔ اس طرح منطق اسلامی علوم کی فنی تدوین میں داخل ہوئی اور بالآخر وہ اسلامی کتب خانہ کا ایک مستقل جزء بن گئی۔ اب غیر ضروری طور پر یہ سوال سامنے آگیا کہ قدیم منطق کو چھوڑنا ہے تو اسلام کی قدیم فنی کتب کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر اتنا چھاگیا ہے کہ خود اسلامی علوم اس کے نیچے دب کر رہ گیے ہیں۔

تاریخ کا سبق

المامون (۲۱۸- ۱۷۰ھ، ۸۳۳- ۷۸۶ء) ساتواں عباسی خلیفہ ہے۔ وہ اپنے والد ہارون الرشید کی وفات کے بعد محرم ۱۹۸ھ میں بغداد کے تخت خلافت پر بیٹھا۔ وہ علم اور عمل دونوں اعتبار سے ممتاز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگوں اور شورشوں کا زمانہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے زمانہ میں علم وفن کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ المامون ہی نے بغداد کے مشہور بیت الحکمت کو قائم کیا تھا۔ بیت الحکمت (۸۳۰ء) ایک عظیم علمی ادارہ تھا جو کتب خانہ، تحقیق اکیڈمی اور دار الترجمہ وغیرہ کا مجموعہ تھا (ہسٹری آف دی عربس ۳۱۰)

مامون کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنے کے لیے رشتہ کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صحیح آدمی کی تلاش کی۔ ۲۰۰ھ میں اس نے آل عباس کے قابل ذکر افراد کو مرو میں جمع کیا۔ کئی مہینے تک ان کی تواضع کی۔ وہ ان میں سے کسی لائق شخص کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنا چاہتا تھا، مگر کوئی عباسی اس کو اپنے معیار کے مطابق نظر نہ آیا۔

آخر کار اپنے وزیر الفضل کے مشورہ (الکامل فی التاریخ ۶/۱۹۷) پر اس نے بنو ہاشم کی علوی شاخ سے مناسب آدمی لینے کا فیصلہ کیا۔ تلاش اور غور وفکر کے بعد اس نے اس منصب کے لیے علی بن موسی الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد بن الحسین بن علی بن ابی طالب کا انتخاب کیا۔

مامون نے ان کو الرضی کا خطاب دیا اور اپنے انتخاب کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ان سے اپنی لڑکی ام حبیب کا نکاح کر دیا۔ ہارون الرشید کی وصیت کے مطابق، مامون کے بعد اس کا بھائی مؤتمن ولی عہد تھا، مگر مامون نے مؤتمن کو معزول کر دیا۔ اور علی الرضی کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وذلك ان المامون رأى ان عليا الرضى خير	اور ایسا اس لیے ہوا کہ مامون نے دیکھا کہ علی الرضی
اهل البيت وليس في بني العباس مثله	اہل بیت میں سب سے بہتر ہیں۔ اور بنو عباس کے
في علمه و دينه فجعله ولي عهده من	اندر علمی اور دینی اعتبار سے ان کے جیسا کوئی نہیں۔
بعده (البدایہ والنہایہ ۱۰/۲۴۷)	پس مامون نے اپنے بعد ان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

ابن اثیر نے یہی بات ان لفظوں میں لکھی ہے کہ : انہ نظر فی بنی العباس و بنی علی فلم یجد احداً افضل ولا اورع ولا اعلم منہ (الکامل فی التاریخ ۶/۳۲۶)

یہ المامون کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے خلافت کے منصب کے لیے بنو عباس کا کوئی فرد نامزد کرنے کے بجائے علوی شاخ کا ایک فرد منتخب کیا۔ کیوں کہ اس کو نظر آیا کہ عباسی خاندان کے مقابلہ میں علوی خاندان کے اندر زیادہ اہل افراد موجود ہیں۔ مگر المامون کے اہل خاندان (بنو عباس) اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے مختلف قسم کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق، انگور میں زہر ملا کر علی الرضیٰ کو کھلا دیا۔ جس سے صفر ۲۰۲ھ میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

فرانسیسی مستشرق پروفیسر ڈامینیک سورڈیل (Dominique Sourdel) نے لکھا ہے کہ المامون کے وقت مسلم دنیا شیعہ گروہ اور سنّی گروہ میں بٹ گئی تھی۔ ایک طرف پیغمبر اسلام کے چچا عباس کے اہل خاندان تھے اور دوسری طرف پیغمبر کے داماد علی سے وابستہ حضرات، پوری عباسی سلطنت کا خلیفہ بننے کے بعد المامون نے طے کیا کہ وہ مسلم امت کی اس تقسیم کو ختم کرے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس کے معاصرین کے لیے سخت تعجب خیز تھا، حتی کہ وہ خود اس کی اپنی حیثیت کے لیے بھی نقصان دہ تھا۔ اس نے یہ کیا کہ اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے لیے اپنے خاندان کے کسی فرد کو نہیں لیا۔ بلکہ اس نے علی الرضیٰ کو اپنا سیاسی جانشین مقرر کیا جو کہ علی بن ابی طالب کے خاندان سے تھے۔ بظاہر دو خاندانوں کے درمیان رقابت کو ختم کرنے کے لیے المامون نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی علی الرضیٰ کے ساتھ کر دیا۔ دونوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لیے مزید اس نے یہ کیا کہ اس نے عباسیوں کے کالے جھنڈے کو چھوڑ کر علویوں کے ہرے جھنڈے کو سرکاری طور پر اختیار کر لیا۔

مگر المامون کی ان کوششوں کا متوقع نتیجہ نہیں نکلا۔ عباسی گروہ اتنا ناراض ہوا کہ بغداد میں باقاعدہ طور پر المامون کی خلافت سے معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ عباسیوں نے المامون کو تخت سے ہٹا کر عباسی خاندان کے ابراہیم کو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کر دیا۔

اس وقت المامون بغداد سے دور مرو میں تھا۔ جب یہ خبریں پہنچیں تو وہ فوراً مرو سے چل کر بغداد کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس لمبے سفر کے دوران یہ واقعہ ہوا کہ فروری ۸۱۸ء میں اس کے وزیر

الفضل کو قتل کر دیا گیا۔ اور علی الرضی بھی زہر آلود انگور کھانے کے بعد اگست ۸۱۸ء میں اچانک مر گئے۔

علی الرضی اور ان کے حامی وزیر الفضل کی یہ اندوہناک موتیں کیوں کر ہوئیں، اس کی توجیہہ کے لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عباسیوں نے ان دونوں کو مروا دیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خود المامون نے اس وقت کے مخالفانہ حالات سے گھبرا کر انھیں ختم کر دیا اور حالات سے مصالحت کرتے ہوئے دوبارہ خلافت کا منصب عباسی خاندان کے حوالے کر دیا (11/417-18)

ابن خلدون نے اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی معاشرہ میں عمومی طور پر جب وازع دینی ضعیف ہو جائے تو اس کے بعد ایک فرد، خواہ بذات خود وہ کتنا ہی صالح ہو، وہ معاشرہ میں صلاح و فلاح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا (مقدمہ ابن خلدون ۲۱۱)

اس طرح کے واقعات کثرت سے تاریخ میں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیاسی نظام سماجی حالات کے تابع ہے۔ جیسے سماجی حالات ویسا ہی سیاسی نظام۔

یہ تاریخی حقیقت بتاتی ہے کہ جو شخص صالح افراد کے ہاتھ میں حکومت کا نظام دینا چاہتا ہو اس کو پہلے سماجی نظام میں اس کے موافق تبدیلی لانا ہوگا۔ اس تبدیلی سے پہلے کبھی صالح افراد کی سیاسی قیادت کسی معاشرہ میں قائم نہیں ہو سکتی۔

اس واضح تاریخی شہادت کے باوجود جو لوگ ایسا کریں کہ ضروری سماجی تبدیلی کے بغیر صالح سیاسی قیادت کا نعرہ لگائیں، وہ یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

نصیحت کا اثر

قال سفیان بن حسین۔ ذکرتُ رجلاً بسوء عند ایاس بن معاویة۔ فنظر فی وجھی فقال۔ اغزوتَ الروم۔ قلت لا۔ قال السند والھند والترك۔ قلت لا۔ قال افسَلِمَ منك الروم والسند والھند و الترك ولم یَسلم منك اخوك المسلم۔ قال فلم اعد بعدھا

(البدایة والنھایة)

سفیان بن حسین کہتے ہیں۔ میں نے ایاس بن معاویہ کے پاس ایک شخص کا ذکر برائی کے ساتھ کیا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ کیا تم نے روم سے جہاد کیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کیا تم نے سندھ اور ہند اور ترک سے جہاد کیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا پھر کیا روم اور سندھ اور ہند تو تم سے محفوظ رہے اور تمہارا بھائی مسلمان تم سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سفیان بن حسین کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اس بات کو نہیں دہرایا۔

قال ابن ابی حاتم قدم سفیان الثوری المدینة فسمع المعافری یتکلم ببعض ما یضحك به الناس فقال لہ یا شیخ اما علمت ان للہ تعالیٰ یومًا یخسر فیہ المبطلون۔ قال فما زالت تعرف فی المعافری حتی لحق باللہ تعالیٰ

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۵۱)

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ سفیان ثوری مدینہ آئے انھوں نے معافری کو سنا کہ وہ کچھ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے لوگ ہنسیں۔ سفیان ثوری نے ان سے کہا کہ اے شیخ، کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہے جب کہ باطل لوگ گھاٹے میں رہیں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ نصیحت معافری میں پہچانی جاتی رہی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے۔

آدمی کا احساس زندہ ہو تو وہ نصیحت کو سن کر فوراً چونک اٹھتا ہے اور اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ مگر جن لوگوں کا احساس مردہ ہو جائے۔ وہ نصیحت کو سنتے ہیں مگر نصیحت ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتی۔ نصیحت سننے کے بعد بھی ان کا وہی حال رہتا ہے جو نصیحت سننے سے پہلے ان کا حال تھا۔

دو مثالیں

دمشق کی مسلم خلافت جس زمانہ میں ولید بن عبدالملک اموی کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ کی طرف سے موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کے حاکم تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ انھیں موسیٰ بن نصیر کی ماتحتی میں انجام پایا۔ موسیٰ بن نصیر نے اولاً معلومات حاصل کرنے کے لیے سردار طریف کو ۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ اسپین بھیجا۔ سردار طریف کی واپسی کے بعد طارق بن زیاد (ایک بربری غلام) کی سرداری میں سات ہزار کا لشکر روانہ کیا گیا۔ یہ لوگ مراکش کے ساحل سے کشتیوں پر روانہ ہوئے اور تقریباً دس میل کا سمندری سفر طے کرکے اسپین کے ساحل پر اتر گئے۔

طارق بن زیاد کو اسپین میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی فوج سے سابقہ پیش آیا۔ طارق ابن زیاد کے ساتھ صرف سات ہزار آدمی تھے اور دوسری طرف ایک لاکھ کی فوج جو ہر لحاظ سے زیادہ مسلح اور زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ ۲۸ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) کو دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس درمیان میں مزید ۵ ہزار فوج طارق کی مدد کے لیے مرکز سے آگئی۔ بارہ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ عیسائیوں سے نہایت بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان کے اوپر فتح حاصل کی۔ اس طرح طارق ابن زیاد نے اسپین میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔

طارق بن زیاد نے فتح کی خبر اپنے امیر موسیٰ بن نصیر کے پاس روانہ کی۔ امیر موسیٰ بن نصیر نے اس کے جواب میں طارق بن زیاد کو لکھا کہ تم نے ملک کا جتنا حصہ فتح کیا ہے اسی پر قائم رہو اور اس سے آگے مت بڑھو۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اسپین کی طرف روانہ ہوئے۔

امیر موسیٰ بن نصیر کا مذکورہ خط طارق بن زیاد کو ملا تو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس وقت پیش قدمی سے رکنا درست نہیں ہے۔ ہم کو آگے بڑھ کر ملک کے بقیہ حصوں کو بھی فتح کرنا چاہیے ورنہ عیسائی طاقتیں اکٹھا ہوکر ہمارے اوپر حملہ کر دیں گی اور ہمارے لیے موجودہ قبضہ کو باقی رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ طارق بن زیاد نے امیر کے مشورہ کے خلاف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ علاقے فتح کر ڈالے۔

امیر موسیٰ جب اسپین پہونچے تو وہ یہ دیکھ کر سخت ناراض ہوگیے کہ طارق نے ان کے حکم کی پروا

نہیں کی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ امیر موسیٰ نے طارق کو اس حکم عدولی پر قید کر دیا۔ تاہم یہ صرف ایک ظاہری کارروائی تھی جو انھوں نے اس لیے کی کہ دوسرے سرداروں کو یہ سبق ہو جائے کہ ماتحت کے لیے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری ہے، وہ دل سے طارق کی بہادری اور حسن کارکردگی پر خوش تھے چنانچہ وقتی تنبیہ کے بعد امیر موسیٰ نے طارق کی اس طرح قدردانی کی کہ ان کو اسپین کی تمام افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔

یہ صورت جو طارق بن زیاد کے ساتھ پیش آئی تھی یہی جلد ہی بعد خود موسیٰ بن نصیر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک کو جب موسیٰ بن نصیر کی فتوحات کا علم ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر اسپین کو فتح کر کے فرانس میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو لکھا کہ تم یورپ میں مزید پیش قدمی نہ کرو اور بلا تاخیر دمشق واپس آجاؤ۔ خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں موسیٰ بن نصیر اندلس سے دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے اندلس کی حکومت اپنے لڑکے عبد العزیز کے سپرد کی اور کثیر مالِ غنیمت اور سونے چاندی کے ساتھ روانہ ہو کر مراکش اور مصر ہوتے ہوئے شام پہونچے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک سخت بیمار ہو گیا جو اس کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ ولید بن عبد الملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبد الملک تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر کثیر اموال کے ساتھ شام پہونچ گیے ہیں تو اس نے موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ابھی باہر رُکے رہو اور دمشق میں داخل ہونے میں جلدی نہ کرو۔ سلیمان بن عبد الملک کا منشا یہ تھا کہ خلیفہ ولید کی وفات کے بعد امیر موسیٰ دمشق آئیں اور اسپین کا مال غنیمت میرے خلیفہ بننے کے بعد دربار میں لایا جائے۔ اس طرح میری تخت نشینی کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ مگر امیر موسیٰ سلیمان بن عبد الملک کے اس پیغام کی رعایت نہ کر سکے اور وہ تیزی سے سفر کر کے دمشق پہونچ گیے۔

امیر موسیٰ کے دربار میں حاضری کے صرف چند دن بعد خلیفہ ولید بن عبد الملک کی وفات ہو گئی اور ۱۶ جمادی الثانی ۹۶ھ کو سلیمان بن عبد الملک خلیفہ قرار پایا۔ سلیمان بن عبد الملک کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ امیر موسیٰ کی حکم عدولی کو حسن نیت پر محمول کر کے معاف کر دے۔ مگر وہ ان کو معاف نہ کر سکا۔ اس نے امیر موسیٰ کے ساتھ سخت سلوک کیا حتیٰ کہ ان کو قید میں ڈال دیا۔ موسیٰ بن نصیر شدید مایوسی اور ناکامی کے عالم میں اگلے ہی سال ۹۷ھ میں وفات پا گیے۔ بوقت وفات ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔

دو تصویریں

کہا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب شیخ بایزید بسطامی کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے۔ یہودی نے کہا۔ میں اسلام کیسے قبول کروں۔ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید بسطامی کا مذہب تھا تو وہ میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں عام مسلمانوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے۔

ایک غیر مسلم شیخ بسطامی جیسے بزرگوں میں جو مذہب دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی دنیا سے کٹ کر گوشہ میں معتکف ہو جائے۔ وہ مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے۔ وہ روزانہ کئی کئی بار قرآن ختم کرے۔ وہ سال بھر روزے رکھے۔ وہ حج کرنے جائے تو ہر قدم پر دو رکعت نفل پڑھے۔ وہ ذکر کے کچھ الفاظ یاد کر کے روزانہ کئی کئی لاکھ بار اس کا ورد کرے، وغیرہ

دوسری طرف عوام کے اندر جو اسلام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اسلام کا نام لے اور عملاً اپنی مرضی پر چلے۔ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے اور انسان کے سامنے اکڑ دکھائے۔ وہ قرآن کو بطور تلاوت پڑھے اور اپنی زندگی کو اس کے احکام سے آزاد رکھے۔ وہ اسلام کے دین کامل ہونے پر فخر کرے مگر اپنی حقیقی زندگی میں جزئی اسلام پر بھی قائم نہ ہو۔ وہ کریڈٹ ملنے والے مقامات پر اسلام کا جھنڈا اٹھائے اور جہاں بظاہر کریڈٹ نہ مل رہا ہو وہاں اسلام سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ قومی دین کو اپنا دین بنائے اور اس کے اوپر خدا کے دین کا لیبل لگا دے۔

اسلام ایک سادہ اور فطری دین ہے۔ وہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اپنی اسی فطری کشش کی وجہ سے دور اول میں اسلام زمین کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسلام کی خود ساختہ شکلیں بن گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے لوگوں کی نظر میں اپنی کشش کھو دی۔

اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ باعتبار حقیقت وہ آج بھی اپنے اندر مکمل کشش رکھتا ہے۔ اگر اسلام کی حقیقی تصویر سے تمام مصنوعی پردے ہٹا دیئے جائیں تو اسلام اپنے آپ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔

ایک عام برائی

یزید کی فوجوں سے حضرت حسین کی جو لڑائی کربلا کے میدان میں ہوئی، اس میں حضرت حسین کے ساتھ ان کے چار فرزند بھی مارے گیے تھے۔ مگر شیعہ مصنفین کی کتابوں میں حضرت حسین کی شہادت کے ذیل میں صرف ان کے ایک صاحبزادے کا ذکر آتا ہے جن کا نام عباس بن علی تھا۔ بقیہ تین صاحبزادوں کے نام سرے سے ذکر نہیں کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نام حضرت علی نے خلفاء ثلاثہ کے نام پر رکھے تھے جن کو شیعہ حضرات جائز خلیفہ نہیں مانتے۔ یعنی ان کے نام تھے ——— ابوبکر بن علی، عمر بن علی، اور عثمان بن علی۔

اپنی پسند کے ناموں کو تاریخ میں شامل کرنا اور جو نام پسند نہ ہوں ان کو تاریخ سے حذف کر دینا صرف شیعہ حضرات کا جرم نہیں ہے۔ اس میں سُنّی حضرات بھی یکساں طور پر شریک ہیں۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے سنّی حضرات تو اس میں اتنا زیادہ مبتلا ہیں کہ شاید ہی کوئی مثال اس کے خلاف مل سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت و قیادت کو دیکھیے۔ وہ واضح طور پر اسی صورت حال کی مثال ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام ہر جگہ شامل کرتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کی تشہیر کرتے ہیں مگر جو ان کے مبغوض نام ہیں ان کو اس طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ایسا کرنا حقیقت کو قتل کرنا ہے۔ اور حقیقت کا قتل بلاشبہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ جس چیز کو ایمان کہتے ہیں وہ حقیقت واقعہ کے اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے خدا کی عظمت کو مان لے۔ انسان کی یہی وہ اعلیٰ ترین صفت ہے جس کو نفسیات کی زبان میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کہا جاتا ہے۔ جنّت کی لطیف دنیا میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو اس اعلیٰ خصوصیت کا ثبوت دیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حقیقت واقعہ کو چھپائیں یا اس کا اقرار نہ کریں وہ جنّت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے نااہل ٹھہریں گے۔

نصیحت

امام عبدالرحمٰن اوزاعی (۸۸ - ۱۵۷ ھ) بہت بڑے عالم تھے۔ مگر وہ اکثر چپ رہتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ مومن کم بولتا ہے اور زیادہ عمل کرتا ہے اور منافق زیادہ بولتا ہے اور کم عمل کرتا ہے (ان المومن یقول قلیلا ویعمل کثیرا وان المنافق یقول کثیرا ویعمل قلیلا)

وہ ظواہر دین کے مقابلہ میں حقیقت دین پر زور دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ عدل کی ایک ساعت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے (ساعة عدل خیر من عبادة الف شهر)

امام اوزاعی کے ایک شاگرد ابوالفضل بن الولید بن مزید نے اپنے استاد کے بارہ میں اپنا تجربہ ان الفاظ میں بتایا ہے:

من نظر فی کتب الاوزاعی یظن انه کان صاحب کلام۔ وما رأیت قط رجلا اطول منه سکوتاً (الشیخ طه الولی، عبدالرحمٰن الاوزاعی، بیروت ۱۹۶۸، صفحہ ۶۷)

جو شخص امام اوزاعی کی کتابوں کو دیکھے گا وہ گمان کرے گا کہ وہ بڑے بولنے والے تھے۔ حالاں کہ ان سے زیادہ دیر تک چپ رہنے والا میں نے کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے امام اوزاعی کو بلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ خلیفہ کو نصیحت کریں۔ اس موقع پر امام اوزاعی نے نصیحت کے جو کلمات کہے ان میں سے ایک فقرہ یہ تھا:

یا امیر المومنین، تدری ما جاء فی تاویل هذه الاية عن جدك (مالهذ الكتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها) قال الصغیرة التبسم والكبیرة الضحك۔ فكیف بما عملته الایدی وحصدته الالسن (صفحہ ۷۴)

اے امیر المومنین کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس آیت کے بارہ میں آپ کے دادا عبداللہ ابن عباس نے کیا کہا ہے (کیسی عجیب ہے یہ کتاب جس نے چھوٹی بڑی ہر چیز لکھ لی ہے) انھوں نے کہا ہے کہ صغیرہ سے مراد مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد ہنسنا ہے۔ پھر ان اعمال کا کیا ذکر جو ہاتھ کریں اور جو زبان سے صادر ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا مطلب یہ تھا کہ ہنسنا اور مسکرانا جن کو تم بالکل معمولی چیز سمجھتے ہو وہ بھی تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جا رہا ہے پھر دوسرے زیادہ بڑے اعمال کا کیا ذکر۔

پکار پر دوڑنے والے

مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کرلیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اور اس کے آس پاس کا کچھ علاقہ اب بھی اس کے قبضہ میں تھا اور یہاں اس کی بقیہ سلطنت کا مرکز قائم تھا۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں قسطنطنیہ کا رومی بادشاہ توفیل بن میخائیل تھا۔ ۲۲۳ھ میں وہ ایک عظیم لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہنچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے قلعہ پر حملہ کیا۔ یہاں اس وقت زیادہ فوج موجود نہ تھی ان حملوں میں اس نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو قتل کیا، انھیں گرفتار کیا اور بہت سے لوگوں کا مثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ شاہ روم کے سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا تو وہ پکاری وامعتصماہ (ہائے معتصم) یہ خبر بغداد میں خلیفہ معتصم عباسی کو پہنچی تو وہ تڑپ اٹھا۔ وہ اس وقت اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ فوراً ہی لبیک لبیک کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النفیر النفیر (کوچ کوچ)

اس کے بعد معتصم اپنی فوج کو لے کر روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (ترکی) میں پہنچا عموریہ اس وقت رومیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ معتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ ان پر منجنیق کے ذریعہ گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ قلعہ کی دیواریں ٹوٹ گئیں اور معتصم مع اپنی فوج کے قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اب رومیوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ چنانچہ انھوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ معتصم نے اپنے تمام قیدیوں کو چھڑایا۔ اور اس عورت کو بھی قید سے آزاد کرایا جس نے رمیوں کے حملہ کے وقت وامعتصماہ کہہ کر آواز لگائی تھی۔

جب کرتب بازی کو کمال سمجھا جانے لگے

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک شخص آیا اور کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنا ایک کرتب دکھاؤں۔ ہارون رشید نے اجازت دے دی۔ آدمی نے اس کے بعد اپنی جھولی سے بارہ بڑی بڑی سوئیاں نکالیں۔ اس نے ایک سوئی کو ہاتھ میں لے کر پھینکا تو وہ ایک فاصلہ پر جاکر کھڑی صورت میں زمین پر گڑ گئی۔ اب اس نے دوسری سوئی پھینکی تو وہ پہلی سوئی کے سوراخ میں جاکر اٹک گئی۔ پھر اس نے تیسری سوئی پھینکی تو وہ دوسری سوئی کے سوراخ میں پیوست ہوگئی۔ اسی طرح وہ ایک ایک سوئی پھینکتا گیا اور ہر سوئی اپنے سے پہلے والی سوئی کے سوراخ میں داخل ہوتی چلی گئی، اور بالآخر بارہ سوئیوں کا ایک جال بن گیا۔ ہارون رشید حیرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر میں اس نے دس درہم ہاتھ میں لے کر آدمی کی طرف پھینکے اور کہا خذ ھا اف لک (اس کو لے، تجھ پر افسوس ہے) کاش تو نے کسی مفید کام میں یہ مہارت پیدا کی ہوتی۔

جب مسلمان زندہ تھے تو ان کو معلوم تھا کہ کرتب بازی میں اور ایک حقیقی کام میں کیا فرق ہے — مگر آج انھیں مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ اس فرق سے بے خبر ہوکر کرتب بازی پر وہ داد دے رہے ہیں جو صرف حقیقی عمل پر دی جانی چاہئے۔ قافیہ میں قافیہ ملانے والے شاعر، الفاظ کا گلدستہ بنانے والے مقرر، سیاسی شوشوں سے قوم کا مستقبل برآمد کرنے والے قائد، سب اسی قسم کے کرتب باز ہیں جیسے ہارون رشید کے زمانہ کا مذکورہ شخص۔ مگر ہارون رشید نے اپنے زمانہ کے کرتب باز سے کہا تھا کہ تیرا برا ہو۔ جب کہ آج کے کرتب بازوں کو شاندار خطابات مل رہے ہیں اور ہر طرف ان کے استقبالیہ جلسوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے کرتب بازوں کی فہرست میں سب سے آگے وہ انقلابی قائدین ہیں جو تقریروں کے ذریعہ ہر روز شاندار محل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ ہارون کے زمانہ کے آدمی نے اگر سوئیوں کا کھیل دکھایا تھا تو یہ لفظوں کے کھیل دکھا رہے ہیں۔ ایک قائد ایک ”عظیم اسلامی اجتماع“ میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریر کو اس جملہ پر ختم کیا — ”مسلم نوجوانوں کو میرا پیغام ہے کہ کفر کے چراغ کو جہاں پاؤ بجھا دو“

اس قسم کی مجاہدانہ تقریریں آج ساری مسلم دنیا میں گونج رہی ہیں۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو انتہائی جذباتی بنا دیا ہے مگر ”کافر اقوام“ پر ان کا بس نہیں چلتا۔ کیوں کہ ان قوموں نے طاقت کے تمام اسباب جمع کر کے اپنے کو انتہائی طاقت ور بنا لیا ہے اور مسلمان ان کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بے حد پیچھے ہیں۔ تاہم لوگوں کے بڑھے ہوئے جوش جہاد کو کوئی نشانہ درکار تھا۔ چنانچہ اب ہر ایک نے خود اپنے مسلم بھائیوں میں ”کفر کے چراغ“ دریافت کر لئے ہیں اور ہر ایک ان کو بجھانے میں مشغول ہے۔ کہیں یہ جہاد گولیوں کی بوچھار کے ذریعہ جاری ہے اور جہاں اس کے مواقع نہیں ہیں وہاں اس سے کمتر کسی کارروائی کی صورت میں۔ کفر کا چراغ بجھانے کا نعرہ عملاً اسلام کا چراغ بجھانے کے ہم معنی بن گیا ہے۔ کہیں فوجیں خود اپنے ملک پر چڑھائی کر کے فتح کے جھنڈے لہرا رہی ہیں۔ کہیں قائدین خود اپنے مسلمان سیاسی حریفوں کو قتل کر کے مجاہد کا لقب لے رہے ہیں۔ کہیں کوئی جماعت خود اپنے بھائی کو جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا کر باطل کو مٹانے کا کارنامہ انجام دے رہی ہے۔

بڑھیا کی دلیری

عباسی خلیفہ مامون الرشید (۲۱۸ ـ ۱۰۷ھ) اپنے سیاسی مخالفین کے لئے نہایت بے رحم تھا مگر عام لوگوں کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں بغداد کی ایک بوڑھی عورت آئی۔ اس نے خلیفہ مامون سے شکایت کی کہ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس ایک زمین تھی جس کو ایک ظالم نے مجھ سے چھین لیا۔ میں نے کتنی ہی فریاد کی مگر اس نے نہیں سنا۔ میری دادرسی کی جائے۔ مامون نے پوچھا: وہ کون ظالم ہے جس نے تمھارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، بڑھیا نے اشارہ سے بتایا کہ وہ وہی ہے جو اس وقت آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ مامون نے دیکھا تو وہ اس کا لڑکا عباس تھا۔ مامون نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ وہ شہزادہ کو پکڑ کر اٹھائے اور اس کو لے جاکر بڑھیا کے برابر کھڑا کردے۔ وزیر نے ایسا ہی کیا۔ اب مامون نے حکم دیا کہ دونوں اپنا اپنا بیان دیں۔

شہزادہ عباس رک رک کر آہستہ آواز میں بولتا تھا۔ لیکن بڑھیا بلند آواز میں بول رہی تھی۔ وزیر نے بڑھیا کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ آہستہ بولو، خلیفہ کے سامنے زور زور سے بولنا آداب کے خلاف ہے۔ مامون نے اپنے وزیر کو روکا اور کہا: اس کو آزاد چھوڑ دو، جس طرح چاہے اسے کہنے دو۔ سچائی نے بڑھیا کی زبان تیز کردی ہے اور شہزادہ کو اس کے جھوٹ نے گونگا بنا دیا ہے۔ بڑھیا کا دعویٰ صحیح تھا۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ بڑھیا کے حق میں ہوا اور اس کی زمین شہزادہ سے لے کر اس کو واپس کردی گئی

(عقد الفرید جلد اول)

سچائی اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ سچائی پر ہونے کا احساس آدمی کو دلیر بنا دیتا ہے۔ سچا آدمی بے دھڑک ہو کر بولتا ہے۔ سچے آدمی کا بیان تضاد اور تصنع سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔ سچا آدمی بولتا ہے تو اس کے چہرے پر احساس جرم کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس کی آواز جھجک سے خالی ہوتی ہے۔ اس بنا پر سچے آدمی کی آواز میں قوت آجاتی ہے۔ وہ سننے والے کو مفتوح کرلیتی ہے۔

اس کے برعکس جس آدمی کا معاملہ جھوٹ پر مبنی ہو وہ کبھی قوت کے ساتھ نہیں بول سکتا۔ وہ ہمیشہ احساس جرم میں مبتلا رہتا ہے جس کا اثر اس کے لہجہ پر آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ وہ بے یقینی کے ساتھ بول رہا ہے۔ جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش میں اس کے بیان کے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان رکھنے کے باوجود وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔

اچھا گمان رکھئے

خلیفہ منصور عباسی وہ شخص ہے جس نے بغداد کا شہر بنایا۔ عباسی دور میں بغداد کو اتنی ترقی ہوئی کہ وہ دنیا کا سب سے عظیم شہر بن گیا۔

بغداد جیسے ایک شہر کی تعمیر بڑا مہنگا منصوبہ تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد خلیفہ منصور کو اس کے اخراجات بہت گراں گزرنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس کے ایک درباری ابو ایوب موریانی نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ کسریٰ کے محل جو بغداد سے کچھ فاصلہ پر ہیں ان کو توڑ دیا جائے اور ان کا اینٹ پتھر بغداد کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

خلیفہ منصور کے وزیر خالد بن برمک کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ " امیر المومنین، ایسا نہ کیجئے۔ کسریٰ کے محل اسلام کی فتح کی نشانی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہماری نسلوں کے اندر اسلام کی عظمت کا یقین بڑھتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کو توڑنے کا جو خرچ ہے وہ اس سے حاصل ہونے والے فائدے سے زیادہ ہے "۔ مگر خلیفہ منصور نے خالد بن برمک کی رائے کی پروا نہیں کی۔ اس نے کہا "تم کسریٰ کے محل کو توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہے ہو کہ تمھارے اندر ابھی تک عجمیت کا تعصب پایا جاتا ہے" خالد بن برمک عجمی (ایرانی) تھا، خلیفہ منصور نے اس کی رائے کو اس کے ایرانی النسل ہونے کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا کہ وہ کسریٰ کا محل توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ کسریٰ کی عظمت کا نشان باقی رہے۔

خلیفہ منصور نے کسریٰ کے محل کو توڑنے کا حکم دے دیا۔ مزدوروں اور کارکنوں کی ایک فوج اس کام پر لگ گئی کہ وہ محل کو توڑے اور اس کے پتھروں کو گدھوں اور خچروں پر لاد کر بغداد لے آئے۔ مگر بہت جلد منصور کو اندازہ ہوا کہ اس طرح جتنا عمارتی سامان ملتا ہے اس سے زیادہ اس کے اوپر خرچ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے درمیان ہی میں اس کام کو روک دیا۔

کسی کے مشورہ کو مشورہ کی حیثیت سے دیکھئے، اس کو بدنیتی پر محمول نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قیاس غلط ہو اور مشورہ دینے والے نے واقعی وہ مشورہ دیا ہو جو آپ کے لئے سب سے بہتر اور مفید ہے۔

تیسرا باب

زندگی کی کامیاب منصوبہ بندی کے لئے
تاریخ سے بہتر کوئی رہنما نہیں۔

عصری تقاضے

عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کا زمانۂ حکومت ۱۸۷۶ سے ۱۹۰۹ تک ہے۔ اس نے ترکی میں ریفارم لانے کی کوشش کی۔ اس نے تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ تاہم بعض اسباب سے ملک میں اس کی شدید مخالفت ہوئی اور اس کو تخت سے معزول کر دیا گیا۔

قدیم زمانہ میں ترکی اپنے عظیم بحری بیڑے کے لیے مشہور تھا۔ مگر جب یورپ میں بھاپ کی طاقت دریافت ہوگئی اور بحری جہازوں کو اسٹیم انجن کے ذریعہ چلانے کا دور آیا تو ترکی اس میدان میں بہت پیچھے ہوگیا۔ مزید یہ کہ اس کا پچھڑاپن اس نوبت کو پہنچا کہ نئے طرز کی دخانی کشتیوں کو حاصل کرنا اور ان کو استعمال کرنا بھی ایک خطرناک فعل سمجھا جانے لگا۔

سلطان عبدالحمید ثانی پہلا شخص تھا جس نے بھاپ کی طاقت سے چلنے والا بحری بیڑہ (اُسطول) تیار کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ جب دخانی کشتیاں تیار ہوگئیں تو اس کے بعد وقت کے ترک علماء نے اصرار کیا کہ اس کو استعمال کرنے سے پہلے اس پر بخاری شریف کا ختم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کشتیوں کو سمندروں میں داخل کرنا ان کے نزدیک مخدوش تھا۔ علماء کا اصرار جب بہت بڑھا تو بعض ترک افسروں نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ بحری بیڑا بخار (بھاپ) سے چلتا ہے نہ کہ بخاری سے (اِنَّ الاُسطُولَ یسیرُ بالبخار لا بالبخاری)

بحری بیڑہ جیسے معاملات میں علماء کا دخل دینا بجائے خود جائز تھا۔ مگر علماء کو جاننا چاہیے تھا کہ اس کے لیے انھیں سب سے پہلے جدید تقاضوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔ جدید دور کو سمجھے بغیر جدید معاملات میں دخل دینا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے علماء نے ہر جگہ یہی نادانی کی ہے۔ ترکی سے لے کر عرب تک اور ہند سے لے کر روس تک ہر جگہ اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے علماء نے دور جدید کا کوئی مطالعہ نہیں کیا۔ وہ عصری تقاضوں سے بالکل بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں ان پر فرض تھا کہ وہ مسجد اور مدرسہ کے دائرہ میں اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ مگر وہ اپنی حد پر نہیں رکے۔ ان کی نادانی کی چھلانگوں نے موجودہ زمانہ میں ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

خود شکن بنئے

سبکتگین ایک ترکی غلام تھا، سامانی (ایرانی) حکمرانوں نے اس کو غزنہ (افغانستان) کا گورنر بنایا۔ بعد کو حالات سے فائدہ اٹھا کر اس علاقہ میں اس نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ وہ ۹۷۷ء سے لے کر ۹۹۷ء تک اس غزنوی سلطنت کا حکمراں رہا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اس سلطنت کا حکمراں بنا جو محمود غزنوی (۱۰۳۰-۹۷۱) کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ۱۰۲۴ء میں پہلی بار سومناتھ (گجرات) پر حملہ کیا۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں شیو کا مندر ہے اور اس کے اندر بڑی مقدار میں سونا موجود ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مندر کو توڑ کر اس کا سونا حاصل کرے۔

اس سے پہلے ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے پشاور کے قریب راجہ جیپال کا مقابلہ کیا تھا۔ اس وقت محمود غزنوی کے پاس صرف پندرہ ہزار فوجی تھے۔ اس کے مقابلہ میں راجہ جیپال کے فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، حتیٰ کہ اس کے پاس ۳۰۰ ہاتھی بھی تھے۔ مگر محمود غزنوی نے اس مقابلہ میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اوپر اس کا ایک فوجی رعب قائم ہو گیا۔

چنانچہ محمود غزنوی جب اپنے لشکر کو لے کر سومناتھ پہنچا تو یہاں کے پنڈتوں نے اس سے مل کر یہ پیش کش کی کہ آپ ہمارے مندر کو نہ توڑیں۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو بڑی مقدار میں سونا، چاندی پیش کر دیں گے۔ محمود غزنوی نے اس کے جواب میں کہا: من بت شکنم نہ بت فروش۔ یعنی میں بت کو توڑنے والا ہوں نہ کہ بت کو بیچنے والا۔

محمود غزنوی نے اپنے آپ کو اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مگر اس کے اس فعل کا کوئی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بت شکنی اسلام کا کوئی اصول نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو خود شکن بناتا ہے نہ کہ بت شکن۔ اور کسی مندر کا یا کسی بھی ادارہ کا خزانہ لوٹنا تو اس سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ وہ سراسر حرام ہے۔

خود شکن بننا یہ ہے کہ آدمی خواہش کے پیچھے نہ چلے بلکہ اصولِ حق کا اتباع کرے۔ وہ کبر کی نفسیات سے اوپر اٹھے اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ ذاتی مفاد کے بجائے انصاف کو اہمیت دے۔ وہ خود پرست کے بجائے خدا پرست بن جائے۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (صفر ۱۴۱۴ھ) میں کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱-۱۵۰۶ء) کے بارہ میں ایک تحقیقی مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: لماذا أخطأ کولمبس (کولمبس نے کیوں غلطی کی؟) اس کے لکھنے والے دکتور مظفر صلاح الدین شعبان ہیں۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے:

فی الفترة الممتدة من القرن الثامن و حتی القرن الثانی عشر کانت اللغة العربیة هی لغة العلوم لغالبیة الجنس البشری۔ ولهذا السبب فقد اعتبر کولمبس اللغة العربیة ام جمیع اللغات۔ وهذا یفسر سبب اصطحابه معه فی رحلته الاولی الإسبانی لوییس دی تور الذی یتقن العربیة مترجما خاصا له (صفحہ ۳۰)

آٹھویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ میں عربی زبان ہی دنیا کے بیشتر لوگوں کی علمی زبان تھی۔ اور اسی بنا پر کولمبس نے عربی زبان کو تمام زبانوں کی ماں قرار دیا اور اسی سے اِس کا سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنے پہلے سفر میں ایک اسپینی لوئی دی تور کو خصوصی مترجم کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا جو کہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھا۔

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس طرح آیا ہے —— کولمبس چوں کہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جہاں جا رہا ہے وہاں اس کو وحشی لوگ ملیں گے یا مہذب لوگ، اس نے اپنے جہازوں پر سستے اور معمولی سامان لاد لیے تاکہ وہ وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کا سونا حاصل کر سکے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایک شخص لوئی دی تور کو اپنے جہاز میں بٹھایا جو کہ ایک یہودی تھا اور وہ عبرانی اور کلدانی کے علاوہ کچھ عربی زبان بھی جانتا تھا، اس ضرورت کے پیش نظر کہ وہاں "عظیم خان" سے اس کی ملاقات پیش آ جائے:

> As Columbus did not know whether he was to come across new savages or old civilizations, he loaded his ships with cheap merchandise to relieve aboriginals of their gold, but also took on board one Luis de Torres — "who had been a Jew and knew Hebrew and Chaldeand a little Arabic" — in case he met the "grand khan". (4/938)

یہ اس دور کی بات ہے جو پانچ سو سال پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عربی زبان کا وہی مقام تھا جو آج انگریزی زبان کا مقام ہے۔ اس وقت عربوں کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج اہل مغرب کو حاصل ہے۔ اس وقت عالمی واقعات کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی جس طرح آج وہ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ تبدیلی کسی سازش کی بنا پر پیش نہیں آئی۔ بلکہ تمام تر فطرت کے قانون کے تحت پیش آئی۔ اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ جس کو جو کچھ ملے گا استعداد کی بنا پر ملے گا اور جس سے جو کچھ چھنے گا بے استعدادی کی بنا پر چھن جائے گا۔ اس دنیا میں جو لوگ محروم رہ جائیں انھیں دوسروں کی سازش یا تعدی کا انکشاف کرنے کے بجائے اپنی بے استعدادی کو ختم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر وہ کچھ پائیں گے تو اپنی بے استعدادی کو ختم کر کے ہی پائیں گے۔ شکایت اور احتجاج کی بنیاد پر یہاں انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے کسی خاص نسل یا کسی خاص گروہ کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں کسی ایک انسان کا جو حق ہے وہی دوسرے تمام انسانوں کا حق بھی ہے۔ یہاں کوئی چیز صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو فی الواقع اس کے حق دار ہوں۔

حق دار کون ہے۔ قرآن کے مطابق، حق دار وہ ہے جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہو۔ قرآن میں فطرت کا ایک مستقل اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے (واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض) :

and that which is for the good of mankind remains on the earth

یہی اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ابدی قانون ہے۔ یہاں قیام و استحکام صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جو دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو۔ کسی قوم کی زبان ہو یا اس کی حکومت، کسی قوم کا کلچر ہو یا اس کی اقتصادیات، کسی بھی چیز کو صرف اس وقت تک زمین کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل ہوگی جب کہ اس میں دوسروں کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ نفع بخشی کی صلاحیت کھوتے ہی وہ اپنا غالب مقام بھی کھو دے گی۔

بلند کرداری

ہندستان میں مسلمان بادشاہ بھی آئے اور مسلمان صوفی بھی۔ مگر ہندستان کی غیر مسلم قوموں نے بادشاہوں کو اپنا رقیب سمجھا اور صوفیوں کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے بادشاہوں سے لڑائیاں کیں مگر صوفیوں کے آگے وہ عقیدت سے جھک گئے۔ حتی کہ ان میں سے لاکھوں لوگوں نے ان کے مذہب (اسلام) کو قبول کر لیا۔ آج بھی ہندستان کے لوگ مسلم صوفیوں کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ان کے مزاروں اور درگاہوں پر حاضری دینے والوں میں ان کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب کہ مسلمان بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم بادشاہ ان کو اپنی سطح پر نظر آتے تھے اور مسلم صوفی اپنے سے اونچی سطح پر۔ لوگوں نے دیکھا کہ جس طرح وہ دولت کے حریص ہیں اسی طرح مسلم بادشاہ بھی دولت کے حریص ہیں۔ لوگ اقتدار کے لئے لڑتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اقتدار کے لئے لڑتے ہیں۔ لوگ اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی اپنی خواہش کے پیچھے چلتے ہیں۔ لوگ دوسروں کو لوٹتے ہیں اور مسلم بادشاہ بھی دوسروں کو لوٹتے ہیں۔ مسلم بادشاہ لوگوں کو اسی عام سطح پر نظر آئے جہاں وہ خود تھے۔ ایسی حالت میں مسلم بادشاہوں کے لئے ان کے دل میں کوئی اعلیٰ جذبہ ابھرتا تو کیسے ابھرتا۔

مگر مسلم صوفیوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ انھیں دولت کی تمنا نہ تھی وہ اپنی فقیری میں مگن تھے۔ اقتدار کو چاہنا تو درکنار وہ اقتدار سے دور بھاگنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی خواہش کو معبود نہیں بنایا تھا۔ بلکہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ سخت قسم کی نفسیاتی ورزشیں کرتے تھے تاکہ اپنی خواہش کے شیطان کو زیر کر سکیں۔ وہ دوسروں سے صرف محبت کرنا جانتے تھے۔ ان کے یہاں نفرت کا کوئی گزر نہ تھا۔

ان صوفیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے لئے بھی ان کے پاس جو چیز تھی وہ دعا اور خیر خواہی تھی نہ کہ نفرت اور انتقام۔ ایک صوفی کو ایک شخص نے ایک بار پتھر مارا۔ صوفی کو چوٹ لگی مگر وہ غصہ نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھ کر اس آدمی کو سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے پوچھا کہ آپ نے مجھ کو سینے سے کیوں لگایا جبکہ میں نے آپ کو مارا تھا۔ صوفی نے جواب دیا کہ تمہارے اندر ایک برائی ہے اس لئے تم سب سے زیادہ اس کے مستحق ہو کہ تم کو سینے سے لگایا جائے۔ اس واقعہ کے بعد اس شخص نے توبہ کر لی اور صوفی کا مرید ہو گیا۔

ذمہ دار کون

انیسویں صدی کے وسط کا واقعہ ہے۔ فرانس کے ایک مسیحی مسٹر لیون روش نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ امیر عبدالقادر الجزائری کے یہاں آیا اور امیر کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ اس کے بعد امیر عبدالقادر الجزائری نے اس کو قربت دی۔ اس کو اپنا مشیر خاص بنالیا۔ کئی مہمات میں اس کو بھیجا۔ اسی طرح اس کو جزیرہ عرب بھیجا جہاں اس نے حج ادا کیا۔

لیون روش کی شادی الجزائر کی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی۔ دونوں تقریباً ۱۰ سال تک ایک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ فرانس کی فوجیں الجزائر میں داخل ہوگئیں۔ جنگ کے بعد بالآخر فرانس کو امیر عبدالقادر الجزائری پر فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کے بعد لیون روش فرانسیسی جنرل الدوک دومال سے مل گیا اور کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ میں نے اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ مسیحیت اختیار کر لی ہے۔

یہ واقعہ لیون روش کی مسلمان بیوی کے لئے بہت اندوہناک تھا۔ اس نے کہا کہ اسلام نے اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کردی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تیرے جیسا سانپ زندہ رہے اور لوگ مجھ کو تیری وجہ سے غیرت دلائیں۔ چنانچہ اس نے خنجر لے کر لیون کو قتل کر ڈالا (الثقافۃ العربیۃ، طرابلس دسمبر ۱۹۸۲)

اس طرح کے ارتداد کے واقعات کو عام طور پر اس معنی میں لیا جاتا ہے کہ متعلقہ شخص محض منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اور اپنا کام پورا کر کے اسلام سے نکل گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی ہوں۔ مگر اس نظریہ کو ارتداد کے تمام واقعات پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر وہ ہیں جو کسی تبلیغی جدوجہد کے نتیجہ میں مسلمان نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ میں نے بہت سے نومسلموں سے بات کر کے یہ اندازہ کیا ہے کہ ان کے اسلام کا سبب کوئی گہرا فکری انقلاب نہیں ہوتا۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے مذہب کے معاملہ میں متشدد اور متحمس نہیں ہوتے۔ وہ کسی وقتی اور معمولی پسندیدگی کی بنا پر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اب اگر ان کو خوش قسمتی سے موافق حالات مل گئے تو وہ دھیرے دھیرے اسلام میں پختہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا ابتدائی معمولی

تاثر بالآخر گہرے اسلامی تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر جن کو اسلام کے بعد اچھے حالات نہ ملیں ان کا اسلام کمزور ہوتا رہتا ہے۔ وہ ان کے شعور کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے کمزور اسلام کے ساتھ زندگی گزارتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ دوبارہ اپنے سابق معاشرہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ وہ جس طرح ایک معمولی سبب کے پیش آنے سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اسی طرح دوسرا معمولی سبب پیش آنے سے اسلام کے باہر چلے جاتے ہیں۔

ایک نومسلم کا مسلم معاشرہ میں جذب ہونا مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے، مگر مسلم معاشرہ یہاں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نومسلم اپنے نئے ہم مذہبوں کے درمیان ایک قسم کا اجنبی بن جاتا ہے۔ یہ اجنبیت کبھی کبھی اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ صورت اختیار کرلیتی ہے جس کو ہم "ارتداد" کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اتداد کے اکثر واقعات دشمنان اسلام کی "سازش" سے زیادہ مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ یہ غفلت خاص طور پر تین قسم کی ہے۔

۱۔ دعوت و تبلیغ کا کام ہمارے یہاں اس نہج پر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر گہرا فکری انقلاب پیدا کرے۔ آدمی شعوری تبدیلی کے بغیر کسی سطحی یا عارضی سبب سے اسلام قبول کرلیتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا اسلام بہت زیادہ دیر پا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ ایک نومسلم جب اسلام قبول کرتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف معاشرہ سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اسلام میں پختہ کرنے کے لئے اس کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ مگر مسلمانوں کے یہاں ایسے لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یہ تربیت تمام تر مسلمانوں کی ذمہ داری ہے مگر اس کے لئے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا مسئلہ معاشرہ کا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد نومسلم ایک طرف اپنے معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف مسلم معاشرہ بھی اس کو بھرپور طور پر قبول نہیں کرتا۔ یہ دوطرفہ اجنبیت اس مخلوق کے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہے جس کی تعریف سماجی حیوان Social Animal سے کی گئی ہے۔

اس طرح کے مختلف اسباب اکثر نومسلموں کے اندر چھپی ہوئی بے چینی بن کر موجود رہتے ہیں، وہ مسلسل عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں اور کوئی بڑا واقعہ پیش آنے کی صورت میں اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

تاریخ سبق دیتی ہے

آٹومین لینڈر (۱۹۸۰ – ۱۸۹۵) ایک یہودی سائنس داں تھا۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ ہٹلر کے وی ٹو راکٹ (V-2 Rocket) کے منصوبہ میں کام کر رہا تھا۔ ہٹلر کے زمانہ میں جرمنی میں پہلی بار یہ راکٹ تیار کئے گئے۔ ان راکٹوں نے لندن میں زبردست دہشت پھیلا دی تھی۔ ہٹلر نے جب اپنے ملک کے یہودیوں کے خلاف ظلم و زیادتی شروع کی تو آٹومین لینڈر (Otto Mainlander) اور دوسرے یہودی سائنس داں ہٹلر سے سخت برہم ہو گئے۔

اس برہمی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹومین لینڈر اور تقریباً ایک درجن یہودی سائنس داں جو ہٹلر کے راکٹ کے منصوبہ میں کام کر رہے تھے، وہ ضروری سامان اور فنی راز لے کر بھاگے اور ان کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ امریکہ میں بھی راکٹ کی سائنس پر ابتدائی تجربات ہو رہے تھے۔ جرمنی کے یہودی ماہرین کی مدد حاصل ہونے کے بعد اس تحقیق میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ چنانچہ امریکہ نے راکٹ تیار کر کے جرمن علاقوں پر اتنی تیزی سے حملے کئے کہ ہٹلر کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ انھیں جرمن یہودیوں کی مدد سے امریکہ نے وہ ایٹم بم تیار کئے جو ۱۹۴۵ میں جاپان پر گرائے گئے اور جس کے بعد دوسری جنگ عظیم کا فیصلہ اتحادیوں کے حق میں ہو گیا (۲۱ جنوری ۱۹۸۰)

تاریخ میں اس طرح کے واقعات بار بار ہوئے ہیں۔ کسی شخص یا گروہ کے زوال کا سبب اکثر اس کے وہ اپنے لوگ ہوتے ہیں جن کو وہ شخص یا گروہ اپنی آمرانہ پالیسی کی بنا پر ناراض کر دیتا ہے۔ یہ ناراض لوگ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں اور "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت اس کے دشمنوں سے مل جاتے ہیں۔ اپنوں کے اس تعاون سے دشمن کو غیر معمولی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ اپنے حریف کے خلاف زیادہ مؤثر اقدام کر سکے۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے حریف کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ حریف کے ساتھیوں کی مدد اس کے لئے اس مہم کو آسان کر دیتی ہے جو تنہا اپنی قوت سے اس کے لئے مشکل بنی ہوئی تھی۔ یہ بات ایک خاندان کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک حکومت کے لئے بھی اور اسی طرح ایک پوری قوم کے لئے بھی۔

اپنوں کا ٹوٹ کر حریف سے ملنا بہت سے پہلوؤں سے نہایت خطرناک ہے۔ اس کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ حریف کو اپنے دشمن کے راز معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے کمزور پہلوؤں کو جان کر اس کے مطابق اپنا منصوبہ بناتا ہے اور ٹھیک اس مقام پر وار کرتا ہے جہاں اس کا حریف سب سے کم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں نے "ظالمانہ نظام" کو ختم کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مگر یہی تحریکیں "عادلانہ نظام" کو قائم کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا حقیقت کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک ظالمانہ نظام کو توڑنے کے لئے صرف ظلم دشمنوں کی فوج مل جانا کافی ہے اور وہ ذاتی اسباب کے تحت بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔ مگر عادلانہ نظام کو قائم کرنے کے لئے عدل دوستوں کی ضرورت ہے اور حقیقی معنوں میں عدل دوست اتنے کم ہیں کہ صرف امکان ہی کے درجہ میں ان کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشترک دشمنی کی بنیاد پر قائم ہونے والا اتحاد مشترک دوستی کی بنیاد نہ پا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ نفرت اور بغض کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک محبت کی فضا پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ظلم دشمنی کی بنیاد پر اٹھنے والی بھیڑ عدل دوستی کا نظام قائم نہیں کر سکتی

کتنا فرق

سترھویں صدی میں جب کہ مغربی قومیں ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں، ان سے پہلے ان کے سیاح کثرت سے اِن ملکوں میں آئے۔ انھوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں، لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ لمبی لمبی مدت تک یہاں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہاں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے کتابیں لکھیں اور اپنی حکومتوں اور اپنی قوموں کو یہاں کے حالات سے باخبر کیا۔

انھیں میں سے ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر (Bernier) ہے۔ وہ ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ طبیب تھا۔ اس کے طب نے اس کو موقع دیا کہ وہ جہاں جائے وہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان گھل مل کر رہ سکے۔ وہ اپنے اس فن کی وجہ سے اعلیٰ شخصیتوں تک رسائی کے قابل ہوگیا۔ برنیر ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۴۷ میں اس نے جرمنی، پولینڈ، سوئزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ ۱۶۵۴ میں برنیر ایشیا کے لئے روانہ ہوا۔ چند سال تک شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں گھوما اور ۱۶۵۸ میں ہندستان میں سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ یہ شاہ جہاں کا آخری زمانہ تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی۔

برنیر ہندستان میں چودہ سال تک رہا۔ یہاں وہ سورت سے لے کر کشمیر تک بے شمار بستیوں میں گیا اور ہندستانی زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے پلوٹارک کے اس قول پر عمل کیا ہے کہ جزئی اور معمولی باتوں کو بھی ضرور جاننا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے وہ بڑی بڑی باتوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ ہندستان سے واپس ہوکر برنیر جب فرانس پہنچا تو اس نے فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے سامنے اپنا سفرنامہ ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا: دریائے سین سے نکل کر دجلہ، فرات، سندھ یا گنگا جہاں بھی میں پہنچا، فرانس اور اس کے شہنشاہ کے بارے میں لوگوں کی بہت اونچی رائے پائی۔

ہندستان کے شہروں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد برنیر نے لکھا: یہاں کے شہر اور قصبے خواہ اس وقت بظاہر خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا شہر کوئی نہیں جس میں جلد تباہ اور خراب ہوجانے کی علامتیں نہ پائی جاتی ہوں (۲۲، ۷) ہندستان کی اس وقت کی فوجوں کے بارے میں اس نے لکھا: جب میں ان بے ترتیب فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف ۲۵ ہزار تجربہ کار سپاہ،ا پرنس کونڈی یا مارشل تورین کی قیادت میں ہندستان کی فوج پر، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں

نہ ہو، غالب آسکتے ہیں (۵۵) برنیر نے اپنے تقریباً ۵۰۰ صفحات کے سفرنامہ میں لکھا کہ ہندستان میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جانشینی کے واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے کسی شہزادہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ یا تو خود تخت حاصل کرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس نے لکھا کہ شاہی امرار کا اعزاز موروثی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ایک مستقل طبقہ امرار وجود میں نہیں آپاتا۔ جب تک ایسا نہ ہوگا سیاسی نظام کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ وغیرہ

مغربی ملکوں کے سیاح جس زمانہ میں اپنی قوموں اور بادشاہوں کو اس قسم کی معلومات دے رہے تھے ٹھیک اسی زمانہ میں ہمارے یہاں کیا حال تھا۔ عین اس زمانہ میں لال قلعہ کے حکمراں کو اس کے قصیدہ خواں شاہ جہاں کا خطاب دے رہے تھے اور اس کے ذہن پر یہ تصور بٹھا رہے تھے کہ جو ہندستان کا بادشاہ ہے وہی سارے عالم کا بادشاہ ہے۔ اورنگ زیب کے استاد ملا محمد صالح اپنے شاگرد شہزادہ کو یہ بتا رہے تھے کہ یورپ بس ایک چھوٹے سے جزیرے کے برابر ہے، فرانس اور اندلس کے بادشاہ ایسے ہی ہیں جیسے ہندستان کے چھوٹے چھوٹے راجہ۔ وہ اورنگ زیب کو ایسے فلسفہ اور منطق کا ماہر بنا رہے تھے جو جنگی مقابلوں، طرز حکمرانی اور قوموں کے ترقی وتنزل کو سمجھنے میں کام آنا تو درکنار اس قابل بھی نہ تھا کہ وہ آدمی کے اندر ایسا ذہن بنائے جو دلیلِ صحیح کے بغیر کسی چیز کو تسلیم نہ کرے اور اپنے اور غیر کے بارے میں حقیقی بنیادوں پر رائے قائم کرسکے۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں تفصیل سے بتایا ہے کہ مغل شہزادوں کی تعلیم وتربیت کتنے غیر حقیقی انداز میں دی جاتی ہے (۱۵۶)

یہ تین سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی صورت حال ہمارے یہاں زیادہ مختلف نہیں۔ آج جب کہ دوسری قوموں کے رہنما اپنی قوموں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہے ہیں، مسلم قائدین ہر جگہ مسلمانوں کو جذبات کی شراب پلانے میں مشغول ہیں۔ کوئی پراسرار عملیات میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے کوئی شاعری اور خطابت میں۔ کوئی جلسہ جلوس میں ترقی کا راستہ دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں۔ کوئی تجویزوں اور بیانات کے ذریعہ ملت کی تعمیر کا یقین دلا رہا ہے اور کوئی دوروں اور تقریروں کے ذریعہ ——— ہمارے یہاں "ملا محمد صالح" تو بے شمار ہیں۔ مگر "ڈاکٹر برنیر" کوئی ایک بھی نہیں۔ پوری ملت ایسے افراد سے خالی نظر آتی ہے جو آج کی دنیا کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور خالص واقعاتی انداز میں وقت کے حقائق سے ملت کو باخبر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا محمد صالح بننے کے لئے تو صرف ابن الوقتی کا سرمایہ کافی ہے، جب کہ ڈاکٹر برنیر بننے کے لئے پُرمشقت عمل درکار ہے، اور اپنے کو مشقت میں ڈالنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

جدوجہد نام ہے اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کرنے کا

ہندستان میں مغربی قوموں کے لئے داخلہ کا راستہ سب سے پہلے واسکوڈی گاما (۱۴۶۰-۱۵۲۴) نے پیدا کیا۔ اس کے بعد پرتگالی اور فرانسیسی قومیں اس ملک کے ساحلی علاقوں میں داخل ہوئیں۔ آخر میں انگریز آئے اور ڈیڑھ سو برس کے اندر انھوں نے پورے برصغیر پر قبضہ کرلیا۔ ہند، پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون، برما، تبت، نیپال، سب انگریز کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ ہندستان پر اپنے قبضہ کو دائمی بنانے کے لئے انھوں نے نہر سوئز پر قبضہ کیا اور اس کے بیشتر حصے مہنگی قیمت پر خرید لئے۔

انگریزوں نے نہ صرف ہندستان کی سیاست اور معیشت پر قبضہ کیا بلکہ یہاں کی سرکاری زبان بدل دی۔ تعلیمی نظام ایسا بنایا جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو لارڈ میکالے کے الفاظ میں "پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو"۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت کی مدد سے مسلح ہوکر پورے ملک کو عیسائی بنانے کا کام شروع کردیا۔ اس طرح ایک ایسی حکومت جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ "اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا" اپنے تمام وسائل اور تہذیبی طاقت کے ساتھ ملک کے اوپر چھا گئی اور اپنے اقتدار کو مستقل بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس مادی دنیا میں اور وہ بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی کرسکتا ہے۔

مگر اگست ۱۹۴۷ کا انقلاب بتاتا ہے کہ بات وہیں ختم نہیں ہوجاتی جہاں کوئی اپنے طور پر اسے ختم سمجھ لیتا ہے۔ کوئی قوم خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر دوسری قوم کے اوپر غالب آجائے، پھر بھی کچھ ایسے گوشے باقی رہتے ہیں جہاں سے جدوجہد کرکے دبی ہوئی قوم دوبارہ نئی زندگی حاصل کرلے۔ پھر اس انقلاب ہی کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ کام محض جھنجھلاہٹ کے ساتھ سر ٹکرانے سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے اور حریف کے اس نازک گوشہ کو تلاش کیا جائے جہاں سے مؤثر جدوجہد کا آغاز کیا جاسکتا ہے —— خدا نے اپنی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ہر بار گرنے کے بعد اس کے بندوں کے لئے دوبارہ ابھرنے کا ایک نیا امکان باقی رہے۔ مگر یہ امکان اسی کے لئے واقعہ بنتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو اپنی خود ساختہ راہوں پر دوڑنا شروع کردے، اس کے لئے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

گھڑی کی سوئی بظاہر جہاں سب سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ اس کا شیشہ ہے۔ لیکن گھڑی کی سوئی گھمانے کے لئے کوئی شخص اس کے شیشہ پر زور آزمائی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی چابی پر اپنا ہاتھ لے جاتا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملّت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمارے تمام لیڈر "گھڑی" کے شیشہ پر زور آزمائی کررہے ہیں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ سوئی تو نہ گھومے البتہ غلط طریق عمل کی وجہ سے مسائل میں کچھ اور اضافہ ہوجائے۔

فساد کا ذمہ دار

منتخب التواریخ علامہ عبد القادر بدایونی کی مشہور کتاب ہے۔ موصوف شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ہیں۔ اور اس کے دربار میں رہے ہیں۔ وہ اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ تھا جو حق کا طالب تھا اور اپنے اندر نفیس جوہر رکھتا تھا (بادشاہے کہ جوہر نفیس داشت و طالب حق) اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں بڑا دیندار اور عبادت گزار تھا۔ اس نے سات عالم صرف نماز کی امامت کے لئے مقرر کر رکھے تھے جن میں ایک خود ملّا عبد القادر بدایونی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر کے دربار میں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ہوتی تھی جس میں بادشاہ خود شریک ہوتا تھا (ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند) اکبر جب سفر کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے اس دیندارانہ مزاج کا یہ قدرتی نتیجہ ہوا کہ اس کے دربار میں علماء جمع ہونے لگے۔ اکبر کو حدیثیں سننے اور مسائل دین پر گفتگو کرنے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ علماء کی صحبتوں میں دیر دیر تک بیٹھتا تھا، ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ اکبر کے گرد جمع ہونے والے علماء کی تعداد ایک سو سے بھی اوپر تک پہنچ گئی تھی (جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلد از صد نفر متجاوز بودند) بادشاہ کے گرد جمع ہونے والے یہ علماء قدرتی طور پر بادشاہ کی عنایتوں میں حصہ پانے لگے۔ بس یہیں سے وہ حالات پیدا ہوئے جس نے ایک دیندار بادشاہ کو بے دین بنا ڈالا۔

ظاہر ہے کہ سو آدمی بیک وقت بادشاہ کے قریب نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ پہلا جھگڑا نشست گاہوں پر شروع ہوا۔ ہر ایک اس کوشش میں رہتا کہ وہ بادشاہ کے قریب بیٹھے۔ اب جس کو قریب جگہ نہ ملتی وہ جلن میں مبتلا ہوتا۔ اسی طرح بادشاہ کے انعامات میں جس کو کم حصہ ملتا وہ اس سے حسد کرنے لگتا جس کو اتفاق سے زیادہ انعام مل گیا ہو۔

علماء کا حال یہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو گرانے کے لئے ایک دوسرے کی برائیاں کرنے لگے۔ ملّا بدایونی کے الفاظ میں علماء کے گروہ سے بہت سی بیہودگی ظاہر ہوئی (بدنفسی ہا ازیں جماعت ظاہر شدند) ایک نے دوسرے کے خلاف زبان کی تلوار نکالی، ایک دوسرے کی نفی اور تردید میں لگ گیا۔ ان کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک نے دوسرے کو کافر بنایا، ایک نے دوسرے کو گمراہ ثابت کیا (با یک دیگر تیغ زبان کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہمدگر می نمودند) نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں ان علماء کی گردنوں کی رگیں پھول آئیں، آوازیں بلند ہوئیں اور زبردست شور برپا ہوا

(رگ گردن علماء زماں برآمدہ آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد)

علماء کی ان نازیبا حرکتوں سے بادشاہ کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اس کو سخت گراں گزرا (برخاطر اشرف گراں آمد) اس کے بعد بادشاہ نے پہلی کارروائی یہ کی کہ ملا بدایونی کو حکم دیا کہ اس قسم کے نامعقول عالموں کو آئندہ بادشاہ کی مجلس میں آنے نہ دیں۔ اس کے باوجود علماء کی حرکتیں بند نہ ہوئیں۔ ان کی باتیں بادشاہ کے لئے ایمانی قوت کے بجائے بدگمانی اور برگشتگی میں اضافہ کا سبب بنتی رہیں۔ علماء کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی ضد میں کوئی عالم ایک چیز کو حرام کہتا اور دوسرا اس کو حلال بتاتا۔ ان چیزوں نے بادشاہ کو شک میں ڈال دیا۔ اس کی حیرانی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل مقصد ہی سامنے سے جاتا رہا (در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میاں رفت)

درباری علماء میں سے ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ ان کا سرکاری لقب مخدوم الملک تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے جو دولت جمع کی تھی اس کا حال ملا بدایونی نے ان الفاظ میں لکھا ہے " ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ کے حکم سے ان کے مکان کا جائزہ لیا گیا جو لاہور میں تھا۔ اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ممکن نہ تھا۔ حتیٰ کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے برآمد ہوئے جنھیں مُردوں کے بہانے سے زمین میں دفن کیا گیا تھا۔"

شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ملا عبدالنبی تھے جو اکبر کے زمانہ کے سب کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ پورے ملک کے خطباء اور ائمہ کے درمیان جاگیر تقسیم کرنے کا انھیں اختیار تھا۔ شہنشاہ اکبر ان کا اتنا زیادہ احترام کرتا تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مگر مذکورہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کے درمیان رقیبانہ کش مکش شروع ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو جاہل اور گمراہ ثابت کرنے کے لئے رسالے لکھے۔ ایک نے دوسرے کی بابت لکھا کہ چونکہ انھیں بواسیر ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرے نے لکھا کہ تم اپنے باپ کے عاق کئے ہوئے بیٹے ہو اس لئے تمھارے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ اس قسم کی لایعنی بحثوں سے شاہی کیمپ صبح و شام گونجتا رہتا تھا۔

شہنشاہ اکبر ابتداءً نہایت دین دار تھا اور دینی شخصیتوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مگر دین کے نمائندوں کی خرافات کو مسلسل دیکھنے کے بعد وہ دین سے بھی بیزار ہو گیا اور دینی شخصیتوں سے بھی۔ علماء کا یہ حال تھا کہ جانوروں کی طرح آپس میں لڑتے۔ ایک عالم ایک فعل کو حرام بتاتا اور دوسرا عالم اسی فعل کو حلال قرار دیتا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

علماء عہد خویش را بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند۔	اکبر اپنے زمانہ کے علماء کو غزالی اور رازی سے بہتر
رکاکت ہائے ایشاں را دیدہ قیاس غائب بر شاہد	سمجھتا تھا۔ جب اس نے ان کی پست حرکتوں کو دیکھا تو حال

کردہ سلف را نیز منکر شدند　　　پر ماضی کو قیاس کرکے سب کا منکر ہوگیا۔

اس کے بعد اکبر کے دربار میں علمار کا وقار ختم ہوگیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ دربارشاہی میں ہمیت اختیار کر گئے۔ اکبر کو علمار کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ ابوالفضل اکبر کے سامنے علمار کا مذاق اڑاتا اور اکبر اس کو سن کر خوش ہوتا۔ ملا بدایونی کے الفاظ میں: کسی بحث کے درمیان اگر ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں کفش دوز اور فلاں چرم ساز کے قول سے تم میرے اوپر حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔

حسد اور کبر یہودی علمار کا عام مرض تھا۔ یہی ہمارے علمار کا بھی سب سے زیادہ عام مرض بن گیا ہے۔

صحابہ کرام بھی دین کے عالم تھے۔ مگر ان کے درمیان حسد اور کبر کا وجود نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعد کے زمانہ کے علمار کے اندر یہ اخلاقی برائی اس قدر عمومی طور پر پیدا ہوگئی۔ اس کی وجہ خود علم کا فرق ہے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور تھا اور بعد کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور۔ صحابہ کرام کا نصاب تعلیم صرف قرآن وحدیث تھا، اس کے برعکس بعد کے زمانہ میں دینی نصاب کے نام سے جو تعلیمی نصاب رائج ہوا اس میں قرآن وحدیث برائے نام رہ گئے اور اصل اہمیت دوسرے فنون نے لے لی۔ اس فرق کا نتیجہ لازماً ظاہر ہونا تھا، کیونکہ قرآن وحدیث کے علم سے آدمی کے اندر خشیت پیدا ہوتی ہے (فاطر ۲۸) اور فنی علوم سے احساس برتری (غافر ۸۳)

علم کے ساتھ عام طور پر بڑائی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف خدا کا علم ہے۔ خدا کا علم ایک ایسا علم ہے جس میں آدمی مالک کائنات کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی علم آدمی کے اندر خاکساری پیدا کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے علوم آدمی کے اندر عجب اور گھمنڈ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

خدائی علم ابتدائی زمانہ میں صرف خدا کی کتاب اور رسول کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو فنی بنانے کی کوشش شروع ہوجاتی ہے۔ فنی بنانے کی کوشش میں سادہ خدائی علم اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جو عام دنیوی علوم کی سطح ہے۔ مشکل اصطلاحیں، پیچیدہ اسلوب، منطقی ترتیب، دور از کار بحثیں وغیرہ مل کر دینی علم کو ایسی شکل دے دیتے ہیں کہ وہ کہنے کے لئے بظاہر ایک دینی علم ہوتا ہے۔ مگر اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے وہ ایک عام علم بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آدمی کے اندر نہ کوئی ربانی شعور جاگتا اور نہ اس کے دل میں خوف خدا کا کوئی قطرہ ٹپکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے ماہرین وہی کچھ کریں گے جس کی ایک تصویر اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

خدا کی مدد

عالم اسلام پر مغرب کے حملہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت اس علاقہ سے کاٹ دی۔ سترہویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید ٹکنالوجی کا وجود میں آنا یورپ کے لیے طاقت وقوت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنیٰ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا سمندری راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہونچ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا اور افریقہ کا کوئی مسلم ملک نہ تھا جو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر مغربی استعمار کے قبضہ میں نہ آچکا ہو۔

مادی قوت کے اعتبار سے مسلم اقوام اور مغربی اقوام کا فرق صرف مقداری نہ تھا بلکہ نوعی تھا۔ یعنی عالم اسلام اگر "دستی ہتھیاروں" سے مسلح تھا تو عالم مغرب "دور مار ہتھیاروں" سے۔ ایسی حالت میں لوگوں کا یہ تاثر بظاہر بیجا نہ تھا کہ مغرب کا غلبہ اب ختم ہونے والا نہیں۔ مگر قدرت کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (۴۱ - ۱۹۳۹) میں مغربی طاقتیں خود آپس میں لڑ گئیں۔ تاریخ انسانی کی اس سب سے زیادہ بھیانک جنگ نے ان کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات سے واپس چلی جائیں۔

تاہم ایک شدید تر محاذ ابھی باقی تھا۔ یہ مغرب کی صنعتی برتری تھی۔ مسلم اقوام اپنے محدود وسائل اور ناکافی ٹکنکل صلاحیت کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ایلون ٹافلر کے الفاظ (۱۹۷۰) میں سوال یہ تھا کہ مسلم قومیں جب بہزار دقت اپنے آپ کو انڈسٹریل ایج میں پہونچانے میں کامیاب ہوں گی، اس وقت مغرب سپر انڈسٹریل ایج میں پہونچ چکا ہوگا۔ عین اس وقت "پٹرو ڈالر" ایک خدائی کرشمہ بن کر ظاہر ہوا اور اس نے نہ صرف مسلم اقوام کی صنعتی پسماندگی کی تلافی کر دی بلکہ بہت سے پہلوؤں سے ان کو جدید اقتصادی دنیا میں برتری عطا کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کتاب محفوظ کی حامل ہے۔ اس کے طفیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کی دنیوی حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اسی خدائی حفاظت نے تاتاری حملے اور صلیبی لڑائیوں کے وقت مسلمانوں

کو محفوظ رکھا۔ اور اسی نے موجودہ زمانہ میں ان کو جدید طاقتوں کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

تاہم حفاظت کا یہ معاملہ صرف دنیوی پہلو سے ہے۔ آخرت کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ آخرت کی نجات کا تمام تر انحصار، ذاتی اصلاح کے بعد، اس پر ہے کہ ہم خدا کی امانت کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچاتے ہیں یا نہیں۔ رسول نے جس طرح اپنے زمانہ کے لوگوں پر خدا کے دین کی گواہی دی، ٹھیک اسی طرح ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس کا گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو صرف ذاتی اصلاح بھی ان کو خدا کے یہاں بازپرس سے نہیں بچا سکتی۔

ختم نبوّت کے بعد امّت مسلمہ نبوّت کی قائم مقام ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی اسی کارِ شہادت کی ادائیگی پر موقوف ہے جس پر نبی کا معاملہ موقوف ہوتا تھا۔ نبی اگر خدائی پیغام رسانی کے کام کو انجام نہ دے تو خدا کی نظر میں اس کی حیثیت رسالت ہی متحقق نہیں ہوتی تھی (مائدہ - ۶۷) اسی طرح ہم اگر اپنے زمانہ کی قوموں پر دین کی گواہی دینے کا فریضہ ادا نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ ہمارا امّت محمّدی ہونا ہی مشتبہ نہ ہو جائے اور آخرت میں ہم ناکام و نامراد قرار پائیں۔ اگر تمام مسلم قومیں اس کام کے لیے نہیں اٹھتیں تو کم سے کم کسی ایک قوم یا کسی ایک جماعت کا دعوت الی اللہ کے اس کام کے لیے اٹھنا ضروری ہے۔

قدیم زمانہ میں جب کہ سیاست کی بنیاد مذہب پر ہوتی تھی۔ ایک بے ضرر دعوتی تحریک کو بھی حکمراں طبقہ اپنے خلاف ایک خطرہ سمجھنے لگتا تھا۔ اور بہت جلد اس کو مٹانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس مقصد کے لیے اٹھنے والے لوگ آروں سے چیرے گیے۔ اور آگ میں جلائے گیے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مذہب اور سیاست کی علاحدگی نے ہم کو دعوتی کام کا انتہائی قیمتی موقع فراہم کر دیا ہے اگر ہم مناظرہ بازی سے بچیں اور سیاسیات میں اُلجھنے کی غلطی نہ کریں تو آزادی فکر اور سائنسی طریق مطالعہ کے اس زمانہ میں ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ رہ کر ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جدید افکار نے اسلام کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ ان امکانات کو استعمال کیا جائے تو اسلام کو معجزاتی استدلال کے ساتھ جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کے نام پر

عثمانی ترکوں میں سلطان سلیم نہایت بیدارمغز بادشاہ گزرا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب اس کو اقتدار ملا تو ایک طرف یورپ زبردست ترقی کے مقام کو پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف ترکی تقریباً ڈھائی صدی کے عروج کے بعد زوال کا شکار ہو کر "یورپ کا مرد بیمار" بن رہا تھا۔ ان حالات میں سلطان نے ترکی کو ازسرنو طاقت ور اور ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی۔

اس وقت سلطان سلیم کی زبردست مخالفت کی گئی۔ یہ مخالفت کرنے والے ملک کے علمار تھے۔ سلطان نے فوجوں کی جدید تنظیم کے لئے سنگین والی رائفلیں منگوائیں تو علمار نے کہا کہ یہ کافروں کا ہتھیار ہے اور اس بنا پر اس کا استعمال حرام ہے۔ اس نے سپاہیوں کے استعمال کے لئے جدید طرز کی فوجی وردیاں بنوائیں تو علمار نے کہا کہ یہ تشبہ بالنصاریٰ ہے اور تشبہ بالنصاریٰ سے ہم کو منع کیا گیا ہے وغیرہ۔

سلطان سلیم کے عمل کو بے دینی قرار دیا گیا اور یہ کہہ کر عوام کے اندر اس کے خلاف نفرت پھیلائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے اندر کافروں کے طریقے رائج کر کے اسلام کو بگاڑ رہا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ الاسلام عطار اللہ آفندی نے یہ فتویٰ دیا کہ سلطان سلیم قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے اور جو بادشاہ قرآن کے خلاف عمل کرے وہ بادشاہ بننے کے قابل نہیں۔

اس زمانہ میں ترکی عوام پر علمار کا بہت اثر تھا۔ ان کی اس قسم کی باتوں سے سلطان کے خلاف زبردست شورش پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۷ میں سلطان کو تخت سے معزول ہونا پڑا۔

ترک علمار جدید دنیا کی سرحد پر ہونے کے باوجود جدید تبدیلیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اپنے خیال کے مطابق اخلاص سے مگر حقیقۃً سراسر نادانی کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ترک قوم سات سو سال پہلے کی فضا سے نہ نکلنے پائے۔ سلطان سلیم کے بعد سلطان محمود نے ۱۸۲۶ میں دوبارہ عسکری تنظیم میں جدید طریقوں کو رائج کیا۔ مگر ترک عالموں اور درویشوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ بدعت ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر وہ اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہیں تو فوج میں بھرتی نہ ہوں۔

اس قسم کے واقعات نے ترکی کی نئی نسل میں ردعمل پیدا کیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکے۔ ۱۹۰۸ میں نوجوانوں کی جماعت کے ہاتھوں سلطان عبدالحمید خاں کا اقتدار سے بے دخل کیا جانا اسی اسلام بیزاری کا نتیجہ تھا جس نے بالآخر کمال اتاترک کے دور کو پیدا کیا۔

سبق آموز

فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ آگرہ سے ۴۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دوسری بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاہی "عبادت خانہ" بھی تھا۔ یہ عبادت خانہ اکبر کے بعد زمین کے نیچے دب گیا اور اس کے اوپر گھاس اور درخت اگ آئے۔ حال میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مشترک منصوبہ کے تحت اس کی کھدائی کی گئی ہے اور اس کو باہر نکالا گیا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۸ جون ۱۹۸۴)

اس عبادت خانہ میں شہنشاہ اکبر علما کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور ان سے مذہب کے موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ یہیں اس نے اپنا مشہور "دین الٰہی" وضع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لئے کسی ایک مذہب کی بنیاد پر یہاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس نے یہ رائے قائم کی کہ اس ملک میں مغل سلطنت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کے لوگوں کا مذہب ایک نہ ہو جائے۔ تبلیغ کے ذریعہ مذہب کو بدلنا اس کو مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مذہب (دین الٰہی) ایجاد کیا۔ جس میں بزعم خود اس نے تمام مذاہب کی خصوصیات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب اپنی مشترک خصوصیات کی بنا پر ملک کے تمام باشندوں کے لئے قابل قبول ہو جائے گا۔

دین الٰہی کی تصنیف کے دوران اس کو عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھا کہ اس کو انجیل کے فارسی ترجمے کی ضرورت ہے۔ شاہ پرتگال نے یہ فارسی ترجمہ بھیج دیا۔ تاہم اس کا مطالعہ اکبر کے لئے کافی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اکبر نے پوپ (روم) کو لکھا کہ مسیحیت کی تعلیم کے لئے اس کے پاس معلم بھیجے جائیں۔ پوپ نے فوراً دو تربیت یافتہ افراد ہندستان روانہ کر دئے۔

ایک فادر اکوا ویوا (Fr. Acquaviva) اور دوسرا فادر مانسریٹ (Fr. Monserrate) یہ دونوں صاحبان ۲۸ فروری ۱۵۹۰ء کو فتح پور سیکری پہنچے۔ "اکبر نامہ" کی ایک پینٹنگ میں اکبر ان عیسائی معلمین سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔

اکبر نے ان دونوں عیسائی معلمین کو شاہی عبادت خانہ کے پاس "خوشبو خانہ" میں ٹھہرایا۔ مگر یہ دونوں مسیحی صرف "معلم" نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے مذہب کے تربیت یافتہ مبلغ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خوشبو خانہ کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا گرجا گھر تھا جو اکبر کے زمانہ میں قائم ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فادر اکواویوا نے پوپ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں اس نے لکھا کہ میرا احساس یہ ہے کہ اکبر ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو قبول کرلے۔ مگر اس سے اکبر کا اصل مقصد (سلطنت کا استحکام) حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اکبر ایسے اقدام سے باز رہا۔

اس واقعہ میں دو بڑے سبق ہیں۔ ایک سبق یہ کہ دولت اور اقتدار کا حصول اکثر عقل سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کو جب دولت اور اقتدار مل جاتا ہے تو اکثر اس کو وہ ایسے کاموں میں ضائع کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی خوش خیالی تحت "دین الٰہی" وضع کیا تھا۔ اس پر اس نے سلطنت کے بے پناہ وسائل خرچ کئے۔ حالاں کہ اس کا انجام بالآخر یہ ہونا تھا کہ وہ تاریخ کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ جائے اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے سوا کسی اور کو اس سے دل چسپی نہ رہے۔

دوسرا سبق دعوتی ہے۔ اکبر نے پوپ سے مسیحی معلم مانگے اور اس نے فوراً دو تیار شدہ افراد اس کے پاس بھیج دئے۔ جب کہ مسلمانوں سے جدید دور میں بار بار یہی تقاضا کیا گیا ہے مگر وہ اس تقاضے کو کبھی پورا نہ کرسکے۔ مسیحی ادارے اپنی مشنری اسپرٹ کی وجہ سے سیکڑوں سال سے اس پوزیشن میں ہیں کہ مشرق و مغرب میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھیج سکیں۔ جب کہ مشنری اسپرٹ سے محروم ہو کر مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان کے پاس نہ مشرقی ضرورت کے مطابق خدا کے دین کے مبلغ موجود ہیں اور نہ مغربی ضرورت کے مطابق۔

دور جدید میں مسلمانوں کی بربادی کا واحد سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت خدا کے گواہ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں کا اصل نشانہ صرف ایک ہے اور وہ دعوت ہے۔ جن لوگوں کی نظریں اس نشانہ پر جمی ہوئی ہوں وہ اپنے لئے عمل کا صحیح میدان پالیں گے اور جب نظریں اس نشانہ سے ہٹ جائیں تو تمام قوتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی قوم بن جاتے ہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ وہ ایسا گروہ بن جاتے ہیں جس کا کوئی اقدام نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکے۔

تاریخ پکارتی ہے

مغل بادشاہ اورنگ زیب (۱۶۱۸ - ۱۷۰۷) کے آخر عمر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھ سے بے اختیار آنسو جاری ہوگیے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پاس ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا۔ عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر دکن تک لہرا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان آپ کے دل میں باقی ہے جس کے لیے آپ رو رہے ہیں۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا:

سعد اللہ، مردے خواہم　　　　سعد اللہ میں ایک مرد چاہتا ہوں۔

اورنگ زیب کے سامنے وہ کون سا مسئلہ تھا جس نے انھیں گھلا رکھا تھا۔ اور وہ ایک مرد کو حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ان کو نظر آرہا تھا کہ ان کے بعد جو لوگ عظیم مغل سلطنت کے وارث بننے والے ہیں وہ سب خودغرض لوگ ہیں۔ وہ اونچی سطح سے معاملات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑیں گے اور عظیم مغل سلطنت کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ نصف صدی تک حکومت کرنے کے بعد ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس وقت اورنگ زیب کے تین لڑکے تھے جن کا نام معظم، اعظم اور کام بخش تھا۔ اورنگ زیب کے آخر وقت میں شہزادہ معظم کابل کا گورنر تھا۔ شہزادہ اعظم گجرات کا گورنر تھا اور شہزادہ کام بخش بیجاپور کا گورنر تھا۔ اورنگ زیب نے مسئلہ کا آخری قابل عمل حل یہ نکالا کہ اس نے ایک وصیت چھوڑی۔ اس وصیت کے مطابق اس نے مغل سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں لڑکوں کو دیدیا تاکہ اس کے لڑکے اپنے اپنے دائرہ میں رہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہ کریں۔

مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کے مرتے ہی تینوں شہزادے دہلی کے تخت کے دعویدار بن کر کھڑے ہوگیے۔ تقریباً دو سال تک آپس میں لڑائیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش اس میں مارے گیے۔ شہزادہ معظم اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کر کے ۱۷۰۸ء میں دہلی کے تخت پر

بیٹھا اور اپنے لیے شاہِ عالم کا لقب اختیار کیا۔

مگر شاہ عالم کو یہ معلوم نہ تھا کہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دہلی کے تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی اس کو چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۷۱۲ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے جن کے نام یہ تھے: جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ، رفیع الشان۔ ان لڑکوں کے سامنے اپنے باپ کا اسوہ تھا۔ چنانچہ چاروں لڑکوں میں دوبارہ جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ بالآخر ان میں سے تین لڑکے قتل ہو گیے اور جہاں دار شاہ تخت پر بیٹھا۔ مگر اس کو ایک سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے مقتول بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کے دل میں اپنے باپ کے لیے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آخر کار اس نے سازش کر کے جہاں دار شاہ پر قابو پا لیا۔ اس نے جہاں دار شاہ کو تخت سے اتار کر لال قلعہ میں اس کو سولی دے دی۔ یہ ۱۷۱۳ء کا واقعہ ہے۔

فرخ سیر نے اگرچہ اپنے چچا کو مار کر دہلی کا تخت حاصل کر لیا مگر وہ خود بھی صرف چھ سال دہلی کے تخت پر بیٹھ سکا۔ لال قلعہ کے اندر جلد ہی اس کے مخالفین پیدا ہو گیے۔ بالآخر ۱۷۱۹ء میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک روز بھرے دربار میں لوگوں نے فرخ سیر کو تخت سے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد اسے مار مار کر جیل کے اندر ڈھکیل دیا گیا۔ وہ جیل کے اندر ہی رہا یہاں تک کہ گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد شہزادہ رفیع الدرجات دہلی کے تخت پر بیٹھا مگر اس کی مدت حکومت اور بھی کم ثابت ہوئی۔ وہ ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بیٹھا اور ۴ جون ۱۷۱۹ء کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد وہ مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تپ دق کا مریض تھا۔

مغل شہزادوں کی آپس کی جنگ نے دہلی کی مرکزی حکومت کو بالکل کمزور کر دیا۔ صوبوں پر مرکز کی مضبوط گرفت باقی نہ رہی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں آزادی اور خود مختاری کا ذہن پیدا ہو گیا۔ صوبوں کے حاکم دہلی کے برائے نام بادشاہ سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرنے لگے:

> On the decline of the central authority at Delhi, the inevitable centrifugal tendency was manifest in different parts of the Empire, and the provincial viceroys made themselves independent of the titular Delhi Emperor.

An Advanced History of India, (1978) p. 529

چنانچہ دکن کا صوبہ ۱۷۲۴ء میں میر قمر الدین خاں (نظام الملک) کے تحت آزاد ہوگیا۔ صوبہ اودھ میں سعادت خاں نے ۱۷۵۴ء میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ صوبہ بنگال میں سرفراز خاں نے ۱۷۳۹ء میں آزاد ہوکر نواب بنگال کا لقب اختیار کرلیا۔ اسی طرح راجپوت ریاستوں (اودے پور، جودھ پور، جے پور، وغیرہ) نے دہلی کی سیاسی وفاداری ترک کرکے آزاد حیثیت حاصل کرلی۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جو عظیم سلطنت بنائی تھی وہ اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر رہ گئی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت بظاہر ڈیڑھ سو سال تک باقی رہی۔ مگر یہ ڈیڑھ سو سال صرف باہمی قتل وخون کے سال تھے۔ مغل شاہزادے اور امرار اور وزرار ذاتی اقتدار کے لیے مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اور مغل سلطنت دن بدن کمزور اور منتشر ہوتی چلی گئی۔ انگریز اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ملک میں دخیل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ لال قلعہ میں بظاہر مغل تاج دار موجود تھا مگر عملاً سارا اقتدار انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ :

حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم۔

اور یہ کہ تخت بہادر شاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔

آخرکار ۱۸۵۷ کا انقلاب برپا ہوا اور یہ نام کی مغل سلطنت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

مغل سلطنت کی یہ کہانی تمام مسلمانوں کی کہانی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کی ایک تصویر اوپر کی مثال میں نظر آتی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کا حال یہ رہا کہ جس شخص کو بھی کوئی موقع ملا وہ ذاتی بڑائی قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ ملے ہوئے مواقع کو اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر چھوٹی چھوٹی بڑائیاں تو قائم ہوئیں۔ مگر ملّت کی عظیم تر بڑائی قائم نہ ہوسکی۔

ایک فرد جب اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی ہوتا ہے اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ پورے مجموعہ کی بڑائی قائم ہو۔ فرد کی قربانی ہی مجموعہ کی بڑائی کی اصل قیمت ہے۔ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے دوڑے، ایسی قوم کبھی عظمت کا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہوسکتا ہے۔

اتفاق کا نتیجہ

حماسہ کے معنی عربی زبان میں شجاعت وحمیت کے ہیں۔ شجاعت وحمیت قدیم عربی شاعری کے خاص موضوعات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدیم عربی شاعری کے جو منتخبات تیار کیے گئے ہیں ان کو الحماسہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں

سب سے مشہور حماسہ ابو تمام الطائی کا ہے جو سب سے پہلے تیار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو تمام الطائی (م ۲۲۰ ھ) ایک بار خراسان گیا ہوا تھا۔ جب وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں شدید برفباری شروع ہوگئی۔ چنانچہ وہ ھمدان میں اپنے ایک دوست ابوالوفا بن سلمہ کے یہاں ٹھہر گیا۔ ابو فا کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں قدیم عرب شعراء کا کلام بہت بڑی مقدار میں موجود تھا۔ یہ کتب خانہ اس نے ابو تمام کے لئے کھول دیا۔ چنانچہ ابو تمام نے جاڑے کا پورا موسم انہیں کتابوں کے مطالعہ میں گزار دیا۔

اس مطالعہ کے بعد ابو تمام الطائی نے جاہلی دور اور آغاز اسلام کے شعراء کے کلام کا ایک انتخاب (دیوان الحماسہ) تیار کیا جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ انتخاب اتنا جامع اور اتنا نفیس تھا کہ اس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد اسی انداز پر بہت سے منتخبات تیار کئے گئے۔ ابو تمام کا حماسہ ادب عربی کے نصاب کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ادب عربی کی یہ کتاب محض اتفاق (صدفہ) کے نتیجہ میں تیار ہوئی۔

تاریخ کے بہت سے اہم واقعات محض اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آئے۔ مگر اس قسم کے اتفاق سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے سے کچھ ضروری شرطوں کو پورا کر چکے ہوں۔ مثال کے طور پر ابو تمام الطائی اگر عربی زبان کا ماہر نہ ہوتا اور اس کو شعر فہمی کا عمدہ ذوق نہ ہوتا تو مذکورہ اتفاق پیدا ہونے کے باوجود وہ کتاب الحماسہ تیار نہیں کر سکتا تھا۔ ابو تمام اگرچہ خود بھی شاعر تھا۔ مگر اس کے اشعار سے زیادہ اس کا انتخاب مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شعر گوئی کے مقابلہ میں شعر فہمی کی صلاحیت اس میں زیادہ تھی۔ چنانچہ تبریزی نے اس کے بارہ میں کہا ہے:

ان ابا تمام فی حماسته اشعر منه فی شعره (شرح حماسة ابی تمام، المقدمة)

پہچان

اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام نے بھول کر پہلی رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھ دی۔ قل اعوذ برب الناس قرآن کی آخری سورہ ہے، اور نماز کے لئے حکم ہے کہ اگلی رکعت میں آگے کی سورہ پڑھی جائے نہ کہ پیچھے کی سورہ۔

اب امام صاحب کے سامنے سوال یہ تھا کہ اگلی رکعت میں وہ قرآن سے کیا پڑھیں۔ امام صاحب جب اگلی رکعت میں کھڑے ہوئے تو انھوں نے سورہ الم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ اس طرح قرآن کی ترتیب باقی رہی۔ کیونکہ آدمی جب قرآن کو پڑھتے ہوئے سورہ قل اعوذ برب الناس تک پہنچتا ہے تو وہ دوبارہ قرآن کے ابتدائی حصہ سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر امام صاحب کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے۔ نماز کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کا عہدہ بڑھا دیا۔

بعض مرتبہ ایک چھوٹا سا واقعہ آدمی کی شخصیت کا تعارف بن جاتا ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ آدمی غبی ہے یا ذہین۔ وہ جوہر والا ہے یا بے جوہر والا۔

اسی سے اس حدیث کو سمجھا جا سکتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ بعض اوقات آدمی کا چھوٹا سا عمل اس کے لئے بڑے بڑے انجام کا سبب بن جاتا ہے۔ امام بخاری کی روایت کے مطابق اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی هریرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ان العبد لیتکلم بالکلمة من رضوان الله تعالیٰ ما یُلقی لها بالاً یرفعه الله بها درجاتٍ وان العبد لیتکلم بالکلمة من سخط الله تعالیٰ لا یلقی لها بالاً یهوی بها فی جهنم

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ اللہ کی رضا کا کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کر دیتا ہے۔ اور بندہ اللہ کی ناراضگی کا ایک کلمہ کہتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی وجہ سے اللہ اس کو جہنم میں ڈال دیتا ہے۔

بڑاپن

شہنشاہ اکبر نے اپنے لڑکے شہزادہ سلیم کی شادی جے پور کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی تھی۔ اس سلسلہ میں اکبر خود بارات لے کر جے پور گیا۔ نکاح کے بعد جب دولہن کا ڈولا باہر نکلا تو راجہ بھگوان داس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

مار چیری تہار گھر کی باندی   ہم باند غلام رے
(ہماری لڑکی آپ کے گھر کی کنیز ہے اور ہم آپ کے غلام ہیں)

یہ سن کر اکبر تڑپ اٹھا۔ وہ بے تابانہ کھڑا ہو گیا اور راجہ بھگوان داس کو گلے لگا کر کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یوں ہے:

تہار چیری مار گھر کی رانی   تم صاحب سردار رے
(تمھاری لڑکی ہمارے گھر کی رانی ہے اور تم ہمارے سردار ہو)

یہ کہہ کر اکبر نے دولھن کے ڈولے میں خود کاندھا لگا دیا۔ اس کے بعد ساری فضا ہی دوسری ہو گئی، تمام شہزادے اور امرا ر دوڑ پڑے۔ ہر ایک دولھن کا ڈولہ اٹھانے میں سبقت کرنے لگا۔ کچھ دور تک یہی لوگ ڈولہ لے کر چلتے رہے، اس کے بعد اس کو کہاروں نے سنبھالا۔

خلیفہ ہارون رشید کا قول ہے کہ شریف آدمی وہ ہے جو اپنے سے بڑے کو دبائے اور چھوٹے سے خود دب جائے۔ اکبر کا مذکورہ واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکبر ایک بے حد بلند فطرت انسان تھا، اگرچہ وقت کے علمار کے غلط کردار نے اس کو بگاڑ دیا۔

جو لوگ پست طبیعت کے ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت وروں کے ساتھ اخلاق برتتے ہیں اور جس کو کمزور پاتے ہیں اس کو ذلیل کرنے لگتے ہیں۔ مگر اونچی طبیعت والے آدمی کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ دو قسم کا اخلاق برتے۔ وہ ایک کے مقابلہ میں کچھ ہو اور دوسرے کے مقابلہ میں کچھ۔ وہ ہر حال میں سچائی کے سامنے جھکنے والا ہوتا ہے۔ وہ معقولیت کے سامنے بھی اسی طرح دبتا ہے جس طرح قوت کے سامنے۔ وہ کمزور کا بھی اتنا ہی لحاظ کرتا ہے جتنا طاقت ور کا۔ اس کا کردار اصول کے تابع ہوتا ہے نہ کہ لالچ اور خوف کے تابع۔

بڑا آدمی اپنی بڑائی جتا کر حقیقۃً چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اونچی حیثیت والا جب گھمنڈ کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ اپنے کو نیچے گرا لیتا ہے۔

جاننا کافی نہیں

بوعلی سینا (۳۷۰-۴۳۰ھ) بہت عالم فاضل شخص تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے زمانہ کے ایک بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ملے اور ان کے یہاں چند دن گزارے۔ بوعلی سینا جب واپس جانے لگے تو انھوں نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کی خدمت میں رہنے والے ایک شخص سے کہا، آج میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ میرے بعد شیخ میرے بارے میں جو کچھ کہیں وہ تم ایک خط میں لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شیخ کا خیال میرے بارے میں کیا ہے۔

بوعلی سینا کی واپسی کو کئی دن گزر گئے مگر شیخ ابوسعید ابوالخیر نے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کہی۔ اچھا یا برا کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بالآخر کئی دن کے انتظار کے بعد مذکورہ شخص نے شیخ سے سوال کیا کہ حضرت، آپ کے پاس بوعلی سینا آئے تھے، وہ آپ کی نظر میں کیسے آدمی ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا کہ وہ ایک اچھے حکیم ہیں اور ان کے پاس بہت علم ہے۔ مگر وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

مذکورہ شخص نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کا یہ تبصرہ ایک کاغذ پر لکھا اور اس کو بوعلی سینا کے پاس بھیج دیا۔ بوعلی سینا نے اس کو پڑھا تو ان کو بڑا جھٹکا لگا۔ انھوں نے مذکورہ شخص کو اس کا جواب لکھ کر بھیجا۔ اس جواب میں انھوں نے یہ لکھا کہ مجھے تمھاری تحریر پر تعجب ہے۔ میں نے مکارم اخلاق پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ پھر شیخ میرے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق نہیں جانتا۔ مذکورہ شخص نے بوعلی سینا کا یہ جواب شیخ ابوسعید ابوالخیر کو بتایا۔ وہ اس کو سن کر مسکرائے اور کہا:

من ایں نگفتم کہ مکارم اخلاق نہ داند، گفتہ ام کہ ندارد
(فوائد الفواد)

میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکارم اخلاق نہیں جانتے، میں نے یہ کہا ہے کہ وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

ایک چیز ہے "جاننا" اور ایک چیز ہے "ہونا"۔ جاننا ذہن اور حافظہ کی سطح پر ہوتا ہے۔ اور ہوتا آدمی کے پورے وجود کی سطح پر۔ جاننے والا آدمی صرف جانتا ہے اور ہونے والا آدمی خود اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جاننا بہت آسان ہے۔ کوئی بھی شخص پڑھ کر اور سیکھ کر دین و اخلاق کی باتوں کو جان سکتا ہے۔ مگر ہونا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ ہونے کے لئے آدمی کو اپنے آپ کو پیس ڈالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پسا ہوا سفوف ہی پانی میں گھلتا ہے نہ کہ جمے ہوئے ٹکڑے۔ مگر اصل اہمیت اعتبار کی ہے۔ اور حقیقت کی دنیا میں جو کچھ اعتبار ہے وہ ہونے کا ہے نہ کہ جاننے کا۔

جس جاننے کے ساتھ ہونا نہ ہو، حقیقت کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

بربادی کے باوجود

"ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے۔" یہ ایک ابدی اصول ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس اصول کے بہت سے عملی نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی میں جن مسلمانوں کے اوپر اسپین کے دروازے بند کیے گیے تھے، انھیں کے ذریعہ افریقہ کے بربری قبائل میں اسلامی دعوت کے دروازے کھلے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بربری قبائل کے لوگ اپنے پہاڑوں کے حصار میں بند تھے اور اپنی خود مختاری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلہ کو کامیابی سے روکا۔ اور اس بنا پر ان کو مسلمان بنانے میں بہت دشواریاں حائل ہوئیں۔ قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمرا) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

بربری قبائل کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے۔ جو سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیئے گیے تھے۔ اور اس کے بعد افریقہ آکر اسی خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کو سرانجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کار خیر پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو ان کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیت اور نور ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ

روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہونچاؤ۔ خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیئے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات انتخاب کرکے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبائل جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علم طب اور صنائع و حرفت اور تمدن کے دیگر فوائد کی بدولت بربری قبائل کے ہاں اپنا مطلوبہ اثر و رسوخ قائم کرلیا اور ہر ایک خانقاہ اسلامی تعلیم کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم و فضل کی کشش سے بہت سے طالب علم ان کے گرد و پیش جمع ہوگیے، اور کچھ عرصے کے بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کا مذہب ان قبائل کے تمام علاقوں اور صحرائے الجزائر کی بستیوں میں پھیل گیا۔" پریچنگ آف اسلام، صفحہ ۱۳۴-۳۵

پروفیسر آرنلڈ کا مذکورہ اقتباس بتاتا ہے کہ قدیم اسپین کی تاریخ سے دو قسم کے واقعات وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ عیسائیوں نے انھیں اسپین سے ظالمانہ طور پر نکالا۔ دوسرے یہ کہ ان نکلے ہوئے مسلمانوں نے باہر آکر اسلام کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص "پہلے اسپین" کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، "دوسرے اسپین" کو جاننے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جنھیں اندھیرے تو خوب نظر آئیں، مگر اجالے ان کو دکھائی نہ دے سکیں۔

قومی عظمت

رومی شہنشاہیت کا زوال *(Decline and Fall of the Roman Empire)* ایڈورڈ گبن کی مشہور کتاب ہے۔ انگریز مورخ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا خیال اس کو اس وقت آیا جب کہ اس نے روم کے کھنڈرات دیکھے۔ رومی شہنشاہیت کے کھنڈرات میں اس نے یورپ کی عظمتِ ماضی کا نشان دیکھا۔ اور اس کے برباد ہو جانے کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدہ نے ایڈورڈ گبن کے دل میں تڑپ پیدا کی۔ وہ اس موضوع کی تحقیق میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ کتاب لکھی جو کہ نہ صرف رومی سلطنت کی اہم تاریخ ہے بلکہ خود تاریخ نویسی پر خالص فنی اعتبار سے ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح تاریخ کے موضوع پر سرسید کی مشہور کتاب آثار الصنادید (۱۸۴۷) ہے۔ سرسید کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال بھی عظمت ماضی کے "کھنڈرات" کو دیکھ کر ہوا۔ دہلی کی منصفی کے زمانہ میں سرسید نے دہلی کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ان عمارتوں میں انھوں نے سنسان عظمت کا جو مشاہدہ کیا اس نے ان کے اندر ایک تڑپ پیدا کر دی۔ انھوں نے دہلی کی ایک ایک عمارت کی تحقیق شروع کر دی۔ چھٹیوں کو وہ اس طرح استعمال کرتے کہ دہلی کے اطراف کی عمارتوں کو دیکھنے نکل جاتے اور کئی کئی دن تک ان کی تحقیق میں مشغول رہتے۔

اس تحقیق میں انھوں نے غیر معمولی محنت کی۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس قدر بوسیدہ تھیں کہ ان کے کتبے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بہت سے کتبوں سے پوری معلومات حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ کتبے ایسے خط میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ کتبوں پر جو نام درج تھے ان کی تاریخی کتابوں سے تحقیق کرنی پڑتی تھی۔ انھوں نے ان تمام مشکلات کو جھیلا۔ انھوں نے ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش کی۔ اس کے حالات لکھے۔ کتبوں کے چربے اتارے۔ ہر عمارت کا نقشہ مصور سے بنوایا کیونکہ اس زمانہ میں کیمرہ موجود نہ تھا۔ اس طرح انھوں نے تقریباً سوا سو عمارتوں کی تفصیلات مرتب کیں۔

قطب مینار کی غیر معمولی بلندی قدیم زمانہ میں کسی محقق کے لئے زبردست مسئلہ تھی۔ سرسید نے قطب مینار کے اونچے کتبوں کو پڑھنے کے لئے دو بلیاں لگوا کر ان میں چھینکے لٹکوائے اور اس کے اندر بیٹھ کر اوپر گئے اور کتبوں کی نقل تیار کی۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابوتمام کے اس شعر کی مصداق تھی:

و یصعد حتی یظن الوریٰ بان لہ حاجة فی السماء
(وہ اس طرح اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان میں کچھ ضرورت ہے)

عظمت ماضی کے کھنڈر کو دیکھ کر جس طرح گبن اور سرسید مورخ بن گئے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جن کو عظمت ماضی کے کھنڈر نے لیڈر اور مفکر بنادیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ مسلمانوں کو زوال آچکا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دور عظمت کے کھنڈر دیکھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔ کھوئی ہوئی عظمت کے شکستہ مناظر کو دیکھ کر ان کا دل پار پارہ ہوگیا۔

قائدین کی بھیڑ میں کوئی نظر نہیں آتا جس نے جنت کے باغوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھا ہو اور جہنم کے شعلوں کی لپٹ محسوس کرکے تڑپ اٹھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں آخرت کی دعوت کی کوئی حقیقی تحریک نہ اٹھ سکی۔ البتہ قومی عظمت کو حاصل کرنے کی تحریکیں اتنی زیادہ ابھر آئیں کہ ان کے شور سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کان بہرے نہ ہو جائیں۔

عروج وزوال

عروج وزوال کے تاریخی قانون کو قرآن میں مختصر طور پر اس طرح بیان کیا گیا ہے: اللہ کسی گروہ کے مابقوم (حالت قومی) کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے مابانفس (حالت نفسی) کو نہ بدلے (انفال ۵۳، رعد ۱۱) ان آیات میں مابانفس کی تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو افراد کی سطح پر ہوتی ہے۔ کیونکہ "نفس" افراد ہی کی سطح پر پایا جاتا ہے نہ کہ اجتماع کی سطح پر۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے افراد میں بگاڑ آگیا ہو۔ اسی طرح قوموں کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب کہ افراد کی سطح پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔ اس سنت الٰہی کے مطابق اصلاح قوم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اصلاح افراد سے شروع کیا جائے نہ کہ انقلاب حکومت سے۔ انقلاب حکومت کے نعرہ سے کام کا آغاز گویا کسی گروہ کے مابقوم کو مابقوم سے بدلنے کی کوشش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش ایک ایسی دنیا میں نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جس کے پیدا کرنے والے نے اس کے مابقوم کی تبدیلی کو اس کے مابانفس کی تبدیلی کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔ یہ باغ کو باغ سے نکالنے کی کوشش ہوگی۔ جب کہ اس دنیا میں باغ کو صرف بیج سے نکالا جاسکتا ہے۔

"تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا" —— یہ قول جس طرح دوسری قوموں کے لئے صحیح ہے ٹھیک اسی طرح وہ ہمارے اوپر بھی صادق آتا ہے۔ ہماری طویل تاریخ ہر قسم کے سبق آموز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص جب کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو اکثر وہ انھیں ناکام تجربات کو دہراتا ہے جو اس سے پہلے بار بار پیش آچکے ہیں۔ وہ تاریخ کے قانون کو جانتے ہوئے اپنے آپ کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس سے الگ کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔

تاریخ مسلسل طور پر یہ سبق دیتی رہی ہے کہ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ اس کے افراد میں کیرکٹر کی طاقت پیدا ہو جائے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم افراد میں کیرکٹر پیدا کئے بغیر ترقی کی طرف چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ ساری تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی سربلندی کا راز ابتدائی سطح پر تعمیر و استحکام ہے۔ مگر لوگ موقع ملتے ہی سیاسی ادارہ سے مقابلہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افراد قوم کے درمیان باہمی اتحاد، خواہ جس قیمت پر بھی ہو، باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ مگر معمولی معمولی باتوں پر لوگ ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ حقیقت پسندی کسی بھی کامیابی تک پہنچنے کا واحد زینہ ہے۔ مگر ہمارے رہنما نہایت بے دردی کے ساتھ قوم کو جذباتی ہنگاموں میں مشغول کر دیتے ہیں۔ ملت کو اٹھانے کا کوئی منصوبہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ ملت کے افراد کو اٹھایا جا چکا ہو — ملت کی ترقی کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو بولنے سے زیادہ چپ رہنا جانتے ہوں جو الفاظ سے زیادہ معانی کی زبان سمجھتے ہوں۔ جو طاقت سے زیادہ دلیل کے آگے جھکنے والے ہوں۔ جو کہنے سے زیادہ کرنا جانتے ہوں۔ جو آگے بڑھنے سے زیادہ پیچھے ہٹنے کے بہادر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ جو دنیا سے زیادہ آخرت کو دیکھ رہے ہوں۔ ایسے افراد کے بغیر ملت کی سربلندی کا نعرہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے دلدل کے اوپر دیوار کھڑی کرنا۔

منفی تحریکیں

پروفیسر سی ایم جوڈ نے لکھا ہے: وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے اور جو عوام کے بڑے بڑے گروہوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں ہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی گروہ کے اوپر قیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کر لیں جس سے وہ گروہ نفرت کرے یا وہ کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کر لیں جس سے وہ گروہ ڈرے۔

Guide to Modern Wickedness, P. 153

نفرت اور خوف کے جذبات کو ابھار کر تحریکیں چلانا قرآن کے الفاظ میں عداوت (البقرہ ۳۶) کی بنیاد پر تحریک چلانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں اندھے جھنڈے اور جاہلی نعرہ کے تحت لڑنا کہا گیا ہے:

من قتل تحت رأیۃ عمیۃ یغضب للعصبیۃ ویقاتل للعصبیۃ فلیس من امتی (مسلم)	جو شخص کسی اندھے جھنڈے کے تحت مارا جائے، وہ عصبیت کے لئے غصہ کرے اور وہ عصبیت کے لئے لڑے تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

کسی فرد یا گروہ کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے پیچھے پڑنا خود ایک بہت بڑی برائی ہے۔ پھر برائی کے بیج سے بھلائی کا پھل کیسے نکلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکیں، خواہ وہ حق و صداقت کے نام پر اٹھائی گئی ہوں، ہمیشہ منفی تحریکیں ہوتی ہیں۔ اور منفی عمل سے کبھی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ خدا کی دنیا، زمین سے آسمان تک، مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہے۔ شہد کے چھتہ سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک، ہر جگہ مثبت اصولوں کی کارفرمائی ہے۔ ایسی دنیا میں وہی تحریک نتیجہ خیز ہوگی جو مثبت بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، منفی بنیادوں پر کیا جانے والا شور و غل اور اکھیڑ پچھاڑ ایک قسم کا شیطانی عمل ہے، اور شیطانی عمل سے ملکوتی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔

منفی نعرے لے کر اٹھنا شخصی قیادت قائم کرنے کے لئے انتہائی مفید ہے۔ مگر اس قسم کی تحریک اصلاح کے مقصد کے لئے اتنی ہی بے فائدہ ہے۔ ہر تحریک اپنی دعوت اور سرگرمیوں کے مطابق اپنے متاثرین کا ذہن بناتی ہے۔ جو تحریک منفی بنیادوں پر اٹھے وہ یقیناً اپنے عمل کے دوران لوگوں کا ذہن بھی منفی انداز کا بنائے گی۔ پھر ایسے منفی ذہن کے لوگوں کا انجام خدا کی مثبت دنیا میں اس کے سوا کیا ہے کہ وہ یہاں بالکل بے جگہ ہو جائیں اور کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

چوتھا باب

تاریخ کا مقصد داستاں گوئی نہیں۔ تاریخ کا مقصد انسانی تجربات سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔

ایک مثال

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں انسانی حقوق پر (Human Rights) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ حقوق انسانی کا تصور اگرچہ قدیم زمانہ سے شاعروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں کے یہاں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر عملی صورت میں وہ صرف اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ (8/1183)

ایک شخص اگر صرف اس مقالہ کو پڑھے، اس سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکے تو وہ اس موضوع کے بارے میں سخت ترین غلط فہمی کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا انقلاب، مغربی تہذیب کے ظہور سے ہزار سال پہلے، عرب میں اپنی کامل ترین صورت میں واقعہ بن چکا تھا۔ مغربی ملکوں میں حقوقِ انسانی کی بحالی خود اسی اسلامی انقلاب کا نتیجہ اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا واقعہ ہے۔

خود مغربی علماء میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کھلے طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مصنف ایچ جی ویلز (۱۸۶۶-۱۹۴۶) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا پہلا پیراگراف اہل اسلام کے درمیان مال اور خون کے تمام جھگڑے کو کالعدم کر رہا ہے۔ اس کا آخری حصہ ایک کالے حبشی کو خلیفہ کے برابر کا درجہ دے رہا ہے۔ انھوں نے دنیا میں باوقار اور منصفانہ معاملہ کی عظیم روایت قائم کی۔ انھوں نے لوگوں میں فیاضی کی روح پھونکی۔ انھوں نے ایک ایسا سماج بنایا جو تاریخ کے کسی بھی پچھلے سماج سے زیادہ بے رحمی اور اجتماعی ظلم سے پاک تھا:

> The reader will note that the first paragraph sweeps away all plunder and blood feuds among the followers of Islam. The last makes the believing Negro the equal of the Caliph… they established in the world a great tradition of dignified fair dealing, they breathed a spirit of generosity, and they are human and workable. They created a society more free from widespread cruelty and social oppression than any society had ever been in the world before.

اس دنیا میں حقیقت سے انکار کی مثالیں ہیں اور اسی کے ساتھ حقیقت کے اعتراف کی مثالیں بھی۔

ماضی اور حال

مسیح الملک حکیم اجمل خاں (۱۹۳۰ - ۱۸۶۴) کو طب اور علاج میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ ۱۹۱۰ سے ۱۹۱۶ تک ہندستان کے وائسرائے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شہرت سے متاثر ہو کر وائسرائے نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو ان کے پاس طبی مشورہ کے لیے بھیجا۔ وہ دہلی میں ان کے مطب میں آئے تو دیکھا کہ وسیع مطب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سکریٹری پر اس کا بہت اثر ہوا۔ واپس جا کر اس نے وائسرائے سے اس کا ذکر کیا۔ وائسرائے نے کہا کہ وہ ہندستان کے مقناطیس ہیں:

He is the magnet of India.

حکیم اجمل خاں کی اسی عظمت و مقبولیت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب وہ قومی سیاست میں داخل ہوئے تو اس کے اندر انھوں نے مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ دہلی میں ان کے مکان (شریف منزل) میں وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں۔ مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر محمد اقبال، وغیرہ۔ حکیم صاحب نے مسلم ملکوں کے علاوہ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا وغیرہ کے سفر بھی کیے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ جدید میڈیکل سائنس ابھی اپنے عروج کو نہیں پہونچی تھی۔ اس زمانہ میں ابھی طب کی اہمیت پوری طرح باقی تھی۔ اس وقت مسلمان فنِ طب کے امام تھے۔ آج ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ روایتی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے آگے تھے، سائنسی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گئے۔

سائنس اور سائنسی طب میں مسلمانوں کی اس پسماندگی کی ذمہ داری تمام تر مسلم رہنماؤں پر ہے۔ علماء نے مذہبی بنیاد پر اور لیڈروں نے سیاسی بنیاد پر اور کچھ "مفکرین" نے نظریاتی بنیاد پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم میں کم از کم ایک سو سال دنیا سے پیچھے ہو گئے۔

علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے بعد مشرک قیدیوں کے ذریعہ مسلمان بچوں کو تعلیم دلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہر حال میں مطلوب ہے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر علم سے روکنا ہرگز جائز نہیں۔

اخلاق کی طاقت

۱۹۳۲ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اترپردیش) کے علاقہ میں سکھوا نامی ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی لوٹ مار بے پناہ ہوتی جا رہی تھی۔ پولیس کے افراد تک کے لئے ممکن نہیں رہا تھا کہ اس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مگر عین اس زمانہ میں بھی ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی فہرستِ انتقام سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن آئی سی ایس (وفات ۱۹۶۳) تھے۔ صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کے خلاف پولس کی مہم انھیں کی ماتحتی میں چلائی گئی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد سکھوا ڈاکو گرفتار ہوا اور صدیق حسن صاحب نے اس کے مقدمہ کی سماعت کر کے اس کو سزا کا حکم سنایا۔ مگر عین اس زمانہ میں جب کہ صدیق حسن صاحب سکھوا ڈاکو کے خلاف مہم کی قیادت کر رہے تھے، سکھوا ڈاکو نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اکثر رات کو صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر ان کی شرافت کا خیال کر کے کبھی ان پر گولی نہیں چلائی۔

سید صدیق حسن صاحب کی وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک ڈاکو بھی ان کی تعریف اور عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے جو خود سکھوا ڈاکو نے بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک بار پولس والے اس کو گرفتار کر کے سید صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر لائے۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے صدیق حسن صاحب سے کہا: "جنٹ صاحب آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے" یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً اندر گئے۔ اپنی نئی ریشمی قمیص اور کمبل لائے اور اس کو ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو اس کو استعمال کرو یہ تمھارے لئے ہے" (۱۷ مئی ۱۹۶۸)

کوئی شخص خواہ کتنا ہی نہتا ہو اس کے پاس ایک ایسا ہتھیار موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنے حریف کو جیت سکے۔ یہ اخلاق کا ہتھیار ہے۔ ایک حکیم صاحب تھے۔ وہ شہر میں مطب کرتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن اپنے گاؤں آیا کرتے تھے۔ ان سے ان کے گاؤں کے بعض لوگوں کو دشمنی ہوگئی۔ انھوں نے ایک آدمی کو چند سو روپے دئے اور کہا کہ رات کو جب حکیم صاحب واپس آرہے ہوں تو ان کو پکڑ کر مار ڈالو۔ غریب آدمی روپے کے لالچ میں تیار ہوگیا اور گاؤں کے باہر پل کے پاس چھپ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب پل کے پاس پہنچے تو وہ جھپٹ کر سامنے آگیا۔ حکیم صاحب اس کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ان کو مار ڈالنا چاہتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "کیا تم کو وہ دن یاد نہیں جب تم اپنے چھوٹے بچے کو ٹوکرے میں رکھ کر میرے پاس لائے تھے۔ بیماری نے اس کا برا حال کر دیا تھا اور تمھارے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں نے تمھارے لڑکے کا مفت علاج کیا اور وہ اچھا ہوگیا۔ کیا میرے اس احسان کا بدلہ وہی ہے جو تم اب میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو" یہ سنتے ہی آدمی نے اپنی لاٹھی پھینک دی اور حکیم صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے کہا: "آپ نے سچ کہا۔ میں روپے کے لالچ میں آپ کو مارنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ مگر اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے معاف کر دیں" ایک جانور کو کسی قسم کی اخلاقی دلیل حملہ کرنے سے روک نہیں سکتی۔ مگر انسان کو جیتنے کے لئے ایک اخلاقی دلیل بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں ایک اخلاقی دلیل ہو نہ کہ محض الفاظ کا ایک مجموعہ۔

اللہ کو بہت یاد کرو

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۸۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے خلیفہ مولانا سعید احمد صاحب مرحوم نے ایک بار حافظ صاحب قبلہ سے پوچھا کہ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثیر کرو (احزاب ۴۱) اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا کہ ذکر کثیر (بہت یاد) کا اطلاق کتنے عدد پر ہوتا ہے تو لوگوں نے مختلف اعداد بتائے۔ کسی نے کہا ۲۵ ہزار بار اللہ کا نام لینا ذکر کثیر ہے، کسی نے کہا ۵۰ ہزار بار ذکر کرنا ذکر کثیر ہے۔ مگر ۲۵ ہزار یا ۵۰ ہزار تو گنتی کی حد نہیں ہیں۔ ان سے آگے بھی گنتیاں ہیں۔ اس قسم کے کسی محدود عددی نصاب کو ذکر کثیر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ خدا لامحدود ہے، اس لئے اس کا ذکر کثیر بھی ایسی گنتی پر ختم ہونا چاہیے جو گنتی کی آخری حد ہو۔

حافظ حامد حسن علوی نے جواب دیا: ذکر کے معنی ہیں عدم نسیان۔ نہ بھولنے کی حالت۔ مثلاً ایک شخص کو حکومت کا افسر یہ حکم سنا دے کہ اتوار کے دن تم کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ تو اس خبر کو سننے کے بعد اگرچہ وہ آدمی روزمرہ کے معمولات میں مشغول نظر آئے گا۔ وہ کھائے پئے گا، بیوی بچوں کے ساتھ رہے گا۔ مگر اس کا ذہن ہر لمحہ پھانسی کے ذکر (یاد) میں مشغول رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو پائے گا۔ بس اس مثال سے ذکر کی حقیقت سمجھ سکتے ہو۔

ذکر حقیقۃً ایک مستقل یاد کا نام ہے نہ کہ کوئی عددی نصاب پورا کرنے کا۔ جب آدمی اللہ کو پالیتا ہے تو وہ اس کی روح میں سما جاتا ہے، وہ اس کے خون میں تیرنے لگتا ہے۔ ہر موقع پر اس کو خدا کا خیال آتا رہتا ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ یاد کبھی سینہ کی کسک بن کر اس کو تڑپا دیتی ہے۔ کبھی اس کے دل کو پگھلا کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ کبھی خوف یا محبت کے کلمہ کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ کبھی شکر یا دعا بن کر اس کی زبان سے ٹپک پڑتی ہے۔

ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے، ذکر دل کی ایک حالت کا نام ہے۔ دل کے کے اندر اٹھنے والی یہ موجیں کبھی الفاظ کی صورت میں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں، یہ الفاظ ذکر و دعا کے معروف الفاظ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر معروف الفاظ بھی، وہ عربی میں بھی ہو سکتے ہیں اور آدمی کی اپنی مادری زبان میں بھی۔ مگر ذکر یقینی طور پر کسی قسم کے تکرار الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ اس قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں خدا کو یاد کرنے والے الفاظ زبان سے نکل پڑتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار کو ذکر کہنا ایسا ہی ہے جیسے ریکارڈ کی آواز کو ایک زندہ انسان کا کلام کہا جائے۔

کل اور آج کا فرق

فرانس کے شہر رائن (Rouen) میں ۱۲۰۰ اور ۱۲۲۵ء کے درمیان چھ بار آگ لگی۔ ہر بار پورا شہر جل کر خاک ہو گیا۔ کیوں کہ اس وقت فرانس میں آگ بجھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۱۲۰۰ء تک یورپ کے کسی شہر میں پختہ سڑکیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ لوگ گھر کا کوڑا سڑکوں پر ڈال دیا کرتے تھے جس کی صفائی کے لئے کوئی سرکاری انتظام موجود نہ تھا۔ رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے نکلتا تو وہ لالٹین لے کر نکلتا۔ کیوں کہ شہروں میں روشنی کا رواج نہ تھا۔ آج کی طرح پولس کا انتظام نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنی پڑتی تھی۔ یہ دور جس کو "قرون وسطیٰ" کا دور کہا جاتا ہے، اس وقت یورپ کے شہروں میں بدنظمی عام تھی۔ مکانات معمولی مٹی کے ہوتے تھے۔ اس قسم کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد عالمی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"یہاں قرون وسطیٰ کے شہروں کی بابت جو کچھ لکھا گیا اس کا کوئی جزء اس شان دار تہذیب پر چسپاں نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین میں قائم کی تھی۔ مسلمانوں کا شہر قرطبہ قرون وسطیٰ میں یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا، اس کے باشندے اعلیٰ ترین معیار زندگی پر فخر کر سکتے تھے جو یورپ میں کہیں بھی سیکڑوں برس تک موجود نہ تھا"

World Book Encyclopedia (1963) Vol. 12(M) p. 429

مسلمان جو کسی وقت ساری دنیا میں سب سے آگے تھے، آج دنیا بھر میں سب سے پیچھے کیوں ہو گئے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے اندر تعمیری ذہن نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگرچہ بہت بڑے پیمانہ پر سرگرمیاں دکھا رہے ہیں۔ مگر یہ سرگرمیاں منفی ذہن کی پیداوار ہیں نہ کہ مثبت ذہن کی پیداوار۔ دور اول کے مسلمانوں کو قرآن کے ایجابی فکر نے متحرک کیا تھا، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ صرف وہ شکایتیں ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے پیدا ہوئی ہیں۔ شکایتی ذہن کے تحت کبھی تعمیری سرگرمیاں وجود میں نہیں آتیں۔ شکایت اور احتجاج کی زمین پر صرف شور و غل اور منفی ہنگاموں کی فصل اگتی ہے اور وہی آج بہت بڑے پیمانہ پر ہمارے یہاں اگی ہوئی ہے۔

جہاد کے نام پر

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں روہیل کھنڈ (شمالی ہند) میں روہیلہ خاندان کے نواب رحمت خاں کی حکومت تھی۔ یہ افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ہوش سے زیادہ جوش کے مالک تھے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کی مخالفت ہوگئی۔ کمپنی نے اودھ (لکھنؤ) کے نواب شجاع الدولہ کو نواب رحمت خاں سے لڑادیا۔ اس جنگ میں نواب شجاع الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد حاصل تھی چنانچہ ان کو کامیابی ہوئی اور ۱۷۷۴ میں میرن پور کٹرہ کی جنگ میں نواب رحمت خاں مارے گئے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نواب شجاع الدولہ کی حکومت اودھ اور روہیل کھنڈ (لکھنؤ سے لے کر بریلی) تک قائم ہوگئی۔ تاہم یہ حکومت صرف ۲۷ سال باقی رہی۔ ۱۸۰۱ء میں ادائیگی قرض کے نام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے روہیل کھنڈ کو براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس زمانہ میں ایک مفتی محمد عیوض بدایونی تھے جو بریلی میں افتار کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کا تقرر نواب رحمت خاں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ تاہم بعد کے زمانہ میں بھی وہ بدستور اپنے عہدہ پر باقی رہے۔ طویل خاندانی روایت کی وجہ سے عوام کے اندر ان کو بڑا ادب و احترام حاصل تھا۔ عوام کے علاوہ حکومت کے حلقے بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اس دوطرفہ مقبولیت کو اگر وہ حکمت کے ساتھ استعمال کرتے تو وہ کوئی بڑا دینی کام کرسکتے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے بے معنیٰ تصادم میں ضائع کر دیا۔

۱۸۱۴ کا واقعہ ہے جب کہ روہیل کھنڈ میں انگریزی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ انھوں نے نظم ونسق کو مضبوط بنانے کے لئے ایک اقدام کیا۔ انھوں نے ایک قانون پاس کیا جو "چوکیداری ٹیکس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت بڑے بڑے شہروں میں پولیس کی تنظیم قائم کی جائے اور اس خرچ کو چوکیداری ٹیکس وصول کر کے پورا کیا جائے۔

چوکیداری ٹیکس کا قانون روہیل کھنڈ کے علاقہ کے دوسرے مقامات پر کسی احتجاج یا مزاحمت کے بغیر نافذ ہوگیا۔ لیکن بریلی میں صورت حال برعکس تھی۔ بریلی نوابی دور سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں سابق نواب رحمت خاں کے بچے ہوئے افراد خاندان موجود تھے۔ انھوں نے چوکیداری ٹیکس کو بہانہ بنایا اور اس کے نام پر انگریزی حکومت کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ میں مفتی محمد عیوض نے ان کا پورا ساتھ دیا۔

اب سیاست اور مذہب دونوں ایک ہوگئے۔ مفتی محمد عیوض نے فتویٰ دیا کہ چوکیداری ٹیکس

سراسر ناجائز ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے اوپر جزیہ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے مسلم عوام اس ٹیکس کے خلاف ہو گئے۔ خاص طور پر افغانی پٹھان بڑی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جو پہلے سے انگریزوں سے بگڑے ہوئے تھے، کیونکہ انگریزوں نے ان کی افغان حکومت کو اس علاقہ سے ختم کیا تھا۔

مفتی محمد عیوض کے فتوے کے بعد مسلمانوں کے دبے ہوتے جذبات ابھر آئے۔ شہر بریلی میں زبردست ہڑتال کی گئی۔

مسٹر ڈمبلٹن اس وقت یہاں ضلع مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ڈمبلٹن نے چوکیداری ٹیکس کی وصولی کے لیے ۱۶ اپریل ۱۸۱۶ء کی قطعی تاریخ مقرر کر دی اور اس کا اعلان کرا دیا۔ جب یہ تاریخ آئی تو بریلی کے مسلم عوام بڑی تعداد میں مفتی محمد عیوض کے مکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ مفتی صاحب نے اس مجمع کی قیادت سنبھال لی۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی طرف آ رہا ہے۔ انھوں نے عوام کو ہدایت کی کہ انگریز مجسٹریٹ کو آگے بڑھنے سے روکیں اور اس کو یہاں نہ آنے دیں۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا وہی ہوا۔ انگریز مجسٹریٹ نے بھی آگے بڑھنے پر اصرار کیا جس کی وجہ سے انگریزی پولیس اور مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے درمیان تصادم ہو گیا۔ اس کا نقصان مفتی محمد عیوض اور ان کے حامیوں کو پہنچا کیوں کہ ان کے پاس لاٹھی ڈنڈے کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا جب کہ انگریز پولیس بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس نے مجمع پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں بہت سے افراد ہلاک ہو گئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

تاہم مفتی محمد عیوض نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے حسینی باغ (بریلی) میں مسلمانوں کو جمع کیا اور یہاں پر جوش تقریر کرتے ہوئے جہاد کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی حکومت سے اسلام کو خطرہ ہے۔ اس لئے اس سے لڑنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اطراف کے علاقوں سے بھی لوگ آنے لگے اور چند دن کے اندر تقریباً پانچ ہزار روہیلہ پٹھان تلواروں اور آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مفتی محمد عیوض کی سرداری میں جمع ہو گئے۔

انگریزوں نے مصالحت دکھائی اور گفت و شنید سے مسئلہ کو حل کرنا چاہا۔ مگر مفتی محمد عیوض صاحب جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف بریلی، رامپور، پیلی بھیت، بجنور، بدایوں، شاہجہاں پور تک کے پٹھان جہاد کا اعلان سن کر آتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً ۱۵ ہزار ہو گئی۔

مفتی محمد عیوض کے حوصلے اب بہت بڑھ گئے۔ انھوں نے صلح کے لیے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے مندرجہ ذیل چار شرطیں پیش کیں۔

۱ چوکیداری ٹیکس کو منسوخ کیا جائے۔

۲ بریلی کے انگریز کوتوال کو ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ ہم اس کے اوپر شرعی سزا نافذ کریں۔
۳ پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کے وارثین کو معقول معاوضہ دیا جائے۔
۴ چوکیداری ٹیکس کے تمام مظاہرین کی عام معافی کا اعلان کیا جائے۔

انگریز حکومت تمام شرطوں کو مان سکتی تھی۔ مگر وہ دوسری شرط کو کسی قیمت پر نہیں مان سکتی تھی۔ دوسری طرف مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ گفت وشنید کے دوران بھی وہ پرامن نہ رہے۔ عین اس زمانہ میں ان میں سے کچھ لوگوں نے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کولیسٹر کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ بالآخر انگریز سپاہیوں کی بڑی تعداد نے ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ کو مفتی محمد عیوض کے حامیوں پر حملہ کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی مگر انگریزی بندوقوں کے مقابلہ میں روہیلے افغانوں کے روایتی ہتھیاروں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سو روہیلے جان سے مارے گئے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

اس کے بعد روہیلے افغانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ مفتی محمد عیوض کا تیاری کے بغیر جہاد ایک ہی دن کے مقابلہ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مفتی محمد عیوض بریلی چھوڑ کر رامپور چلے گئے جہاں صرف ایک سال میں ان کا انتقال ہو گیا ——— چوکیداری ٹیکس کو برداشت نہ کرنے والا بالآخر ملت کو اس سے بہت زیادہ بڑی بربادی کے حوالے کرکے اس دنیا سے چلا گیا۔

اس قسم کی بے معنیٰ لڑائیاں جو ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ملّت کے اندر جاری ہیں وہ ہرگز جہاد نہیں ہیں۔ یہ جہاد کے نام پر اپنے جان و مال کو ضائع کرنا ہے۔

جہاد دراصل اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے۔ اور اللہ کا کام دعوت الی اللہ ہے۔ اہل ایمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ممکن قوتوں کو دعوت الی اللہ کے میدان میں لگائیں۔ وہ دوسری قوموں کو ہدایت خداوندی کے راستہ پر لانے کی کوشش کریں۔ یہی اہل ایمان کا اصل جہاد ہے۔

مسلمانوں کو اس اصل جہاد کا صحیح احساس نہیں۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کو اپنے لئے حرام سمجھ لیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتوں میں الجھنے سے داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ختم ہوتی ہے اور معتدل فضا کے بغیر کسی کو کوئی دعوت نہیں دی جا سکتی۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ چھوٹی چھوٹی ناخوشگواریوں کو برداشت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ یقینی طور پر خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مدعو اقوام سے لڑ پڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ان کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ یہ یقینی طور پر نفسانیت ہے نہ کہ خدائی جہاد۔

تاریخ کا نوشتہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ کو تہران کے قصر گلستاں میں ایک بے حد شاندار جشن منایا گیا۔ یہ سابق شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی تھی۔ اس موقع پر جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا اس کے اخراجات کی مقدار اربوں روپے تک پہنچتی ہے۔ اس زمانے میں راقم الحروف نے ”شاہ ایران کی تاج پوشی“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں جشن کی مسرفانہ تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں لکھا تھا۔

”یہ شاہ قسم کے لوگ بھی حالات سے کتنا بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ عوامی انقلاب کے آتش فشاں پہاڑ کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے اس آتش فشاں کو کچھ اور چنگاریاں حاصل ہو جائیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو ان جھوٹے مظاہروں میں سرمایہ خرچ کرنے کے بجائے وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے خرچ کرتے۔ اس طرح اگرچہ ان کے اصلی عیش اور اقتدار میں کمی نہ ہوتی مگر عوام کو خوش کرکے وہ اپنی شہنشاہیت کی عمر کو ضرور طویل کر سکتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ اس دنیا میں حقیقی فکرِ آخرت تو نایاب ہے ہی، دانشمندانہ قسم کی دنیا پرستی بھی نایاب ہے۔ زیادہ تر لوگ بے سوچے سمجھے زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بے شعوری کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں اس وقت انھیں ہوش آتا ہے۔ مگر اس وقت کا ہوش آنا کچھ کام نہیں دیتا“ (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی ۳ نومبر ۱۹۶۷)

مذکورہ تحریر کے تقریباً ساڑھے گیارہ سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں یہ واقعہ ہوا کہ رضا شاہ پہلوی کو اپنا اقتدار اور اپنا تمام جاہ و حشمت چھوڑ کر ایران سے جانا پڑا۔ وہ نہایت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ایک مغربی اسپتال میں مر گئے۔

اس کے بعد ایران میں آیت اللہ خمینی کا دور شروع ہوا۔ فروری ۱۹۷۹ میں جب آیت اللہ خمینی چارٹرڈ ہوائی جہاز کے ذریعہ پیرس سے تہران پہنچے اور سارا ایران خمینی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خمینی اسلام کے نام پر ایران میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ ساری دنیائے اسلام میں اس بات پر خوشی منائی گئی کہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔

تاہم اس معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے عام لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ جس زمانہ میں
کہ جدید حکمراں بھی بالآخر وہی ثابت ہوں گے جو ان سے پہلے کے حکمراں ۔ رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں

اسلام کا عطیہ

فرانس کے حکمراں نپولین بونا پارٹ نے سوئز میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مصر میں اپنی فوجیں داخل کردی تھیں۔ اور مصر کو فرانس کے قبضہ میں لے لیا تھا۔ ۱۷۹۸ میں جب نپولین اسکندریہ میں داخل ہوا تو اس نے عربی زبان میں ایک منشور شائع کیا اور اس کو مصر کے تمام شہروں میں تقسیم کیا۔ اس منشور کا آغاز حسب ذیل الفاظ سے ہوتا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، لا الہ الا اللہ، لا ولد لہ و لا شریك لہ فی ملکہ۔
من طرف الفرنساویۃ المبنی علی اساس الحریہ والتسویہ ---

یعنی شروع اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور اس کے اقتدار میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ (یہ منشور) فرانس کی طرف سے ہے جس کا نظام آزادی اور مساوات کی بنیاد پر قائم ہے۔

الاسلام والفکر المعاصر للدکتور حلمی مرزوق، دار النھضۃ العربیہ، بیروت ۱۹۸۲، صفحہ ۲۹

نپولین نے بظاہر اپنے اس منشور میں (سیاسی مصلحت کے تحت) اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے توحید کو اسلامی عطیہ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے آزادی اور مساوات کو مغربی تہذیب کی دین قرار دیا ہے۔ گویا کہ دنیا کو اگر توحید اسلام کے ذریعہ ملی تو آزادی اور مساوات اس کو فرانس کے انقلاب کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح توحید کی نعمت انسان کو عملاً اسلامی انقلاب کے بعد ملی، ٹھیک اسی طرح آزادی اور حریت کا تحفہ بھی اس کو اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں ملا ہے۔

غیر اللہ کو عظمت دینے کا نام شرک ہے اور اسی غیر خدائی عظمت کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج آزادی اور حریت سے محروم تھا۔ شرک نے کچھ انسانوں کو پیدائشی طور پر برتر ٹھہرا کر دوسرے انسانوں کو ان کے مقابلہ میں پیدائشی طور پر کمتر ٹھہرا رکھا تھا۔ توحید نے ایک خدا کے مقابلہ میں سب کو یکساں حیثیت دیدی۔ توحیدی انقلاب کے بعد تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس نے بالآخر تمام انسانوں کو برابر ثابت کر کے انہیں اس ارتقائی مرحلہ تک پہنچایا جس کو انسانی آزادی اور انسانی مساوات کہا جاتا ہے۔

قدردانی

خلیفہ عبدالحکیم ابتدائً عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ طویل رخصت پر انگلستان گئے تو یہ جگہ خالی ہوگئی۔ مولانا عبدالباری ندوی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۶) قائم مقام صدر کی حیثیت سے اس عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے پرائیوٹ طور پر انگریزی پڑھی تھی۔ مگر سند کے اعتبار سے ان کے پاس میٹرک کی سند بھی نہ تھی۔ ان کے تقرر میں خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا حصہ تھا جو اس وقت حیدرآباد میں صدرالصدور تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد میں ۱۹۲۲ سے لے کر ۱۹۴۵ تک رہے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

" حیدرآباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش ہوئی۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں گزیٹیڈ پوسٹ پر استقلال کے لئے خود اعلیٰ حضرت کی منظوری ضروری تھی۔ ابھی غالبً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی میں (شروانی صاحب کے کسی مہربان) نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ شروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنوا دیا ہے جس کو فلسفہ تو کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے شیروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ شیروانی صاحب نے میرا رسالہ " مذہب اور عقلیات " کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کر کے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہٰذا کی چند سطروں سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے استقلال کی کارروائی پر اپنے دستخط کر دئے۔"

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸) کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ کے گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے ایک بار ان سے دریافت کیا " کیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا موزوں شخص ہے جس کو حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا جائے "۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے مولوی میر حسن کا نام تجویز کیا جو اس وقت مرے کالج سیالکوٹ میں استاد تھے۔ گورنر نے کہا " میں نے ان کا نام آج پہلی بار آپ کی زبان سے سنا ہے۔ کیا مولوی صاحب نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے "۔ علامہ اقبال نے جواب دیا " ان کی لکھی ہوئی تصنیف تو نہیں۔ البتہ ان کی ایک زندہ تصنیف ضرور موجود ہے "۔ گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ " یہ زندہ تصنیف کیا ہے "۔ علامہ اقبال نے کہا " میں ان کی زندہ تصنیف ہوں، وہ میرے محترم استاد ہیں " گورنر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور جلد ہی ایک سادہ تقریب میں مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دے دیا گیا۔

منفی جوش

وکٹر ہیوگو (۱۸۸۵ــ ۱۸۰۲) فرانس کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کے زمانہ میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ وکٹر ہیوگو ایک بار الجزائر گیا۔ وہ کسی ہوٹل میں تھا کہ وہاں کچھ الجزائری مسلمان آ گئے۔ ان مسلمانوں کو "فرانسیسی" کی صورت سے پہلے ہی سے نفرت تھی۔ وہاں اتفاق سے ایک الجزائری مسلمان اور وکٹر ہیوگو کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ فوراً دونوں کے درمیان اشتعال پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آ گئی۔ الجزائری مسلمان طاقت ور تھا۔ اس نے وکٹر ہیوگو کو خوب مارا۔

اس موقع پر وہاں اور بھی کئی الجزائری مسلمان موجود تھے۔ مگر انھوں نے وکٹر ہیوگو کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک "فرانسیسی" کے مارے جانے پر وہ خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے رہے۔ آخر میں وکٹر ہیوگو نے کہا ـــــ اب تو میں اپنے ملک واپس جا رہا ہوں۔ مگر جلد ہی ایک ایسا کام کر دوں گا جو نہ صرف تم سے بلکہ تمھاری نسلوں تک سے اس کا انتقام لیتا رہے۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وکٹر ہیوگو کی لکھی ہوئی سیرت کی کتاب شائع ہوئی جس کے ایک ایک فقرے میں پیغمبر اسلام کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کے سابق سفیر برائے فرانس مسٹر قدرت اللہ شہاب نے اس کی تردید میں ایک کتاب لکھی اور اس کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

مسلمان اس کے لئے بہت جلد تیار ہو جاتے ہیں کہ وہ "معاندین اسلام" کو ذلیل کریں اور ان سے کفر و اسلام کے نام پر لڑائی لڑیں۔ اسی طرح ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی مخالفانہ تحریروں کا تیز و تند زبان میں جواب دیں۔ مگر ایسے لوگ ان کے درمیان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جو ان "معاندین اسلام" کو اسلام کا مدعو سمجھیں اور مثبت انداز میں دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو اسلام کی طرف بلائیں۔

اس قسم کی "خدمت اسلام" سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ یہ بہت بڑا نقصان ہوتا ہے کہ وہ معتدل فضا ختم ہو جاتی ہے جس میں دوسری قومیں اسلام پر غور و فکر کریں۔ دوسری قومیں جب ہمارے لئے نفرت کا موضوع بن جائیں تو ان کے لئے ہمارا دین محبت کا موضوع کیوں بنے گا۔

تھوڑا وقت زیادہ کام

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ـــ ۱۸۱۷) نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا: وقت کم ہے اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہوجاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں (لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین، ۱۸۹۰، صفحہ ۲۴۲)

سرسید نے جو بات اپنے لئے کہی وہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے۔ ہر انسان اس مسئلہ سے دوچار ہے کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہے۔ مگر اس کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ کام کرنا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ اپنے اوقات کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ ہوجائے، نہ صرف غیر ضروری بلکہ کم ضروری کاموں سے بھی دور رہ کر وہ صرف انتہائی ضروری کاموں میں مشغول رہے۔

پھر اگر اس معاملہ کو آخرت تک لے جایئے تو معاملہ اور زیادہ نازک ہوجاتا ہے۔ آخرت ایک ابدی جگہ ہے وہاں آدمی کو ہمیشہ ہمیش تک رہنا ہے۔ مگر آخرت کے لئے کام کرنے کا موقع آدمی کو صرف اس محدود مدت تک ملتا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس دنیا سے اٹھتے ہی آخرت کے لئے عمل کرنے کا موقع ختم ہوجائے گا۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی عمر کتنی کم ہوتی ہے اور اس کا انجام اس کو کتنی زیادہ لمبی مدت تک بھگتنا ہے، آدمی کو اگر واقعی معنوں میں اس کا احساس ہوجائے تو وہ اتنا زیادہ محتاط اور سنجیدہ ہوجائے کہ اپنے اوقات کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی اس کو ایسا معلوم ہو کہ جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

ایک مزدور کے پاس صرف اتنا پیسہ ہو جس سے وہ اپنی دو وقت کی روٹی کا انتظام کر سکے تو وہ اس پیسہ کو محفل رقص کا ٹکٹ خریدنے میں ضائع نہیں کرے گا۔ کسی پیدل مسافر کے پاس اگر اتنا ہی وقت ہو کہ وہ رات کے اندھیرے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے تو وہ راستہ کی تفریح میں مشغول ہو کر یہ خطرہ مول نہیں لے گا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔

مگر آدمی جس بات کو اپنی دنیا کے معاملہ میں بخوبی جانتا ہے اسی کو وہ آخرت کے معاملہ میں بالکل بھول جاتا ہے۔ آدمی کے پاس آخرت کے عمل کے لئے تھوڑا وقت اور بہت معمولی اثاثہ ہے۔ مگر ہر ایک اس کو وقتی تماشوں میں اِس طرح ضائع کر رہا ہے جیسے کہ اسے آخرت کی کوئی خبر ہی نہیں۔

بے فائدہ باتیں

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) کو ایک شخص نے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ فلاں شرعی مسئلہ کی حکمت کیا ہے۔ مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا: حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا کے فعل کی حکمت ہم سے پوچھتے ہو، ہم خود تمھارے فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنا احتساب کریں، اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دیں۔ البتہ خارجی مسائل میں موشگافیاں نکالنے اور ان کی حکمتیں معلوم کرنے کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ذہن قطعاً غیر اسلامی ہے۔ جن لوگوں کا ذہنی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے وہ کبھی حق کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کمانے اور گھر بنانے کا معاملہ ہو تو ہر آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہر آدمی کو سب سے زیادہ فکر یہ ہوتی ہے کہ اس کی کمائی اچھی ہو جائے اور اس کا مکان اچھا بن جائے۔ مگر دین اور آخرت کا معاملہ ہو تو ہر آدمی ایسے مسائل پر بحث کرنا پسند کرتا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو۔

ایک بزرگ جنھوں نے ایک بڑے ادارہ میں ۳۰ سال فتویٰ نویسی میں گزارے تھے، انھوں نے کہا کہ اس پوری مدت میں ہمارے پاس جو استفتار آتے رہے وہ زیادہ تر دوسروں کے بارے میں تھے۔ اپنے بارے میں بہت کم ہم سے کسی نے سوال کیا۔ فلاں کی جائداد میں میرا کتنا حصہ بنتا ہے۔ فلاں شخص جو ایسا اور ایسا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز، وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات تو بہت آتے رہے مگر کسی نے ہم سے یہ نہ پوچھا کہ اس کی اپنی شرعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ اپنے صاحب معاملہ کے حقوق کس طرح ادا کرے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ اختلاف اور شکایت کے موقع پر لوگوں سے کس قسم کا سلوک کرے۔ فلاں شخص جس کو وہ ستا رہا ہے اس کو ستانا اس کے لئے جائز ہے یا ناجائز۔ فلاں آدمی جس کا اس نے پیسہ دبا رکھا ہے وہ اس کو دبانا چاہئے یا نہیں دبانا چاہئے۔ فلاں شخص جس کو وہ بے عزت کر رہا ہے وہ اس کے لئے درست ہے یا نہیں۔

آدمی دوسروں میں گم رہتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے آپ میں گم ہونا چاہئے۔ وہ خارجی مسائل میں جیتا ہے حالاں کہ اس کو اپنے اندرونی مسائل میں جینا چاہئے۔ وہ دوسروں کے دین و ایمان کو ناپتا ہے حالاں کہ اس کو وہ پیمانہ حاصل کرنا چاہئے جس میں وہ اپنے دین و ایمان کو ناپ سکے —— باہر دوڑتے والے بد جانور کی خبر ہر ایک کو ہے مگر اپنے دماغ میں بغض اور انتقام کے جو بد جانور بسیرا لئے ہوئے ہیں اس کی خبر کسی کو نہیں۔ عبادت گاہ کے باہر کا تماشا ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے مگر عبادت گاہ کے اندر ہونے والا تماشا کسی کو نظر نہیں آتا۔

کتنا فرق

۱۹۲۸ میں کلکتہ میں ایک ہی زمانہ میں دو اجلاس ہوئے۔ ایک کانگریس کا، دوسرا تحریک خلافت کا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور مولانا محمد علی تحریک خلافت کے۔ خان عبد الغفار خاں اپنے کچھ پٹھان ساتھیوں کو لے کر کلکتہ گئے اور دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ خان عبد الغفار خاں اپنا ایک تاثر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

” گاندھی جی (کانگرس کے اجلاس میں) تقریر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بار بار کھڑا ہو جاتا تھا اور گاندھی جی پر سخت حملے کرتا تھا۔ گاندھی جی بالکل غصہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ منھ کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس پڑتے تھے۔ اس کا میرے اوپر بڑا اثر ہوا۔ جب میں واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگذشت اپنے ساتھیوں کو سنائی اور کہا کہ دیکھو یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنے مسلمان لیڈروں کے اخلاق کو دیکھو۔

اس وقت ہم کچھ پٹھان لوگ (خلافت کانفرنس میں) محمد علی کے پاس گئے کہ یہ ہمارا لیڈر ہے، اس کے ساتھ اس بارہ میں چند باتیں کریں۔ محمد علی باہر آئے تو ہم نے ان سے اس طریقہ سے اپنی بات کہنی شروع کی کہ محمد علی صاحب، آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کل ہم کانگرس کے اجلاس میں گئے تھے تو وہاں گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بعض نوجوان اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی وجہ سے ان کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا نہیں ہوئی۔ پھر میں نے کہا کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔

محمد علی صاحب ہماری باتیں سنتے ہی بڑے ناراض اور غضب آلود ہوئے اور کہا کہ دیکھو، یہ جنگلی پٹھان ہمیں سمجھانے آئے ہیں اور پھر ہم کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم ان کے اس رویہ سے بڑے مایوس ہوئے اور ناراض بھی۔ اور میں تو پھر اس کے بعد خلافت کے ان جلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوا اور چلا آیا۔ واپس اپنے گاؤں جا کر میں نے اپنے پختون ساتھیوں سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ کلکتہ میں میں خلافت اور کانگرس دونوں کے جلسوں میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہمارے مسلمان لیڈروں اور ہندوؤں کے لیڈروں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایک طرف غصہ کے جذبات بھڑکتے دکھائی دیے اور دوسری طرف محبت اور پریم سے باتیں کی جاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی واقعی ہندوؤں کے ہی لیڈر نہیں رہیں گے بلکہ وہ مسلمانوں کی لیڈری بھی کریں گے۔ ان کا مزاج گرم نہیں۔ بلکہ ان کے جذبات ٹھنڈے ہیں۔ وہ گالیاں کھا کر بھی ہنس دیتے ہیں۔

صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷—۱۸۹۶) مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵—۱۸۸۷) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا سہیل کی علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے زمانہ کا ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ کا واقعہ ہے۔ یونین میں "ام الالسنہ عربی" پر پروفیسر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔ مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے۔ یونین میں مجمع دیکھا تو کہا: مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سنتے چلیں۔ مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے، جلد اٹھ آئیں گے۔ سب لوگ یونین میں آئے۔ مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے۔ سر پہ اونی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پہ ایک ہرے رنگ کا چھجا (شیڈ) لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک تقریر کی۔ حاضرین محو حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچا دیا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میز کے پاس کھڑے کیے گئے۔ تھوڑی سی ناک، اس سے ذرا اتری تھوڑی اور ہاتھ کی صرف انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کردی۔ اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لیے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا سہیل نے بھی "ام الالسنہ عربی" پر تقریر شروع کی۔ پون گھنٹہ تک تقریر کی۔ نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی۔ نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دل نشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ کمال الدین نے بے اختیار ہو کر مولانا کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا: "تمھارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کردوں" (مضامین رشید، صفحہ ۳۴)

مولانا اقبال احمد سہیل ایم اے، ایل ایل بی غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ ان کو عربی، انگریزی اور فارسی پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر یہ ہیں:

اگر کچھ مرتبہ چاہے تو اس ہستی کو باطل کر — کہ دانہ بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر
اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گام زن ہو — ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طَرِقو کی

اسلامی دعوت کا کام وہ انتہائی اعلیٰ معیار کے ساتھ کرسکتے تھے۔ مگر ان کی تمام صلاحیتیں شاعری اور وکالت کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جو فطرت سے اعلیٰ درجہ کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے۔ مگر ان کی اعلیٰ صلاحیتیں اسلام کے کام نہ آسکیں۔ وہ سطحی چیزوں کے پیچھے لگے رہے یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے گئے۔

ایک اہم کتاب

مستشرقین کے جواب میں موجودہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر ان کا اصل جواب یہ ہے کہ علوم اسلام پر ایسی اعلیٰ کتابیں تیار کی جائیں جو اپنی تحقیق اور معلومات کے اعتبار سے مستشرقین کی باتوں کا مثبت جواب بن جائیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ہم عظیم ترکی عالم فواد سیزگین (Fuad Sezgin) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اس میدان میں انتہائی قابل قدر کام انجام دیا ہے۔

موصوف نے ۲۵ سالہ مطالعہ کے بعد حسب ذیل کتاب جرمن زبان میں تیار کی ہے:

Geschichte des Arabischen, Schrifttums, Leiden, 1967

اس کتاب کا معیاری عربی ترجمہ دکتور محمود فہمی حجازی اور دکتور فہمی ابوالفضل نے کیا ہے۔ اس کا نام تاریخ التراث العربی ہے۔ وہ تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کو الهیئة المصریة العامة للکتاب، قاہرہ نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد تین حصوں پر مشتمل ہے اور اسی طرح دوسری جلد بھی:

المجلد الاول: علوم القرآن
علم الحدیث
التدوین التاریخی الی غایة سنة ۴۳۰ھ هجریة تقریبًا
المجلد الثانی: الفقه
العقائد
التصوف الی غایة سنة ۴۳۰ھ هجریة تقریبًا

کتاب کی تیسری جلد تاریخ شعر عربی سے متعلق ہے۔

ہر فصل کے شروع میں نہایت قیمتی مقدمہ ہے جس میں خالص علمی اور تاریخی انداز میں متعلقہ فصل کا تعارف ہے۔ اس کے بعد صحابہ سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی نصف تک ایک ایک اسلامی شخصیت کے حالات اور کارنامہ کا محققانہ تذکرہ ہے جو ان موضوعات پر مستند حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ کتاب بلاشبہ اپنی قسم کی واحد کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ تمام اسلامی اداروں کے کتب خانوں میں کتب حوالہ کی الماری میں موجود ہو۔ اس موضوع پر ماضی میں متعدد قیمتی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ابن الندیم کی الفہرست (۳۷۷) طاش کبری زادہ (م ۹۶۸ھ) کی مفتاح السعادة۔ حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) کی کشف الظنون۔ اسماعیل البغدادی (م ۱۳۳۹ھ) کی ہدیة العارفین۔

ملت کا سرمایہ

ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (پیدائش ۱۹۴۵) عربی اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی طور پر جانتے ہیں اور ایک زبان سے دوسری زبان کا برجستہ ترجمہ کر سکتے ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۸۲ کی ایک ملاقات میں میں نے انھیں قلم کاغذ دیا اور کہا کہ میں ایک انگریزی عبارت بولتا ہوں، اس کو آپ اس کاغذ پر لکھیں اور پھر اس کا ترجمہ عربی زبان میں کریں۔ یہ انگریزی عبارت الرسالہ جولائی ۱۹۸۲ (صفحہ ۱۴) کی تھی جو کہ حسب ذیل ہے:

You've removed most of the roadblocks to success when you've learnt the difference between motion and directon

میں رک رک کر انگریزی عبارت بول رہا تھا اور وہ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے بولنا ختم کیا، انھوں نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میرے ذہن میں تھا کہ انھوں نے انگریزی عبارت لکھی ہے اور اب مطابقت دیکھنے کے لئے کاغذ مجھے دے رہے ہیں تاکہ اس کے بعد اس کا عربی ترجمہ کریں۔ مگر میں نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ کاغذ پر صرف عربی ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ میں جب انگریزی عبارت بول رہا تھا اسی وقت وہ ساتھ ساتھ اس کا عربی ترجمہ لکھتے جا رہے تھے۔ ان کا عربی ترجمہ یہ تھا:

لقد عزلتم معظم عوائق الشارع نحو النجاح عند ما عرفتم الفرق بين الحركة والاتجاه

ملت کے اندر اس طرح کے کتنے نوجوان ہیں جو نادر صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ ملت کا اثاثہ ہیں۔ مگر یہ اثاثہ ملت کے کام نہیں آتا، اس قسم کے تمام لوگوں کو اغیار مہنگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور ان کو دوسرے دوسرے کاموں میں لگا دیتے ہیں، اسلام کے فرزند اسلام کے کام نہیں آتے۔

اسلام کے محاذ پر ہر طرف کمتر صلاحیت کے لوگ لگے ہوئے ہیں اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ دوسرے محاذوں پر اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اسی مسئلہ کے حل پر ملت کے نئے مستقبل کا راز چھپا ہوا ہے۔

کام سے پہلے کام کی بنیاد تیار کیجئے

علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ۱۸۷۵ء میں ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ مگر مسلمانوں کے اس سب سے بڑے تعلیمی ادارہ میں تجارتی تعلیم (کامرس) کا شعبہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں قائم ہوسکا۔ یعنی ادارہ کے ابتدائی قیام کے ۷۰ سال بعد۔

یونیورسٹی میں تجارتی شعبہ کے قائم ہونے کا لطیفہ بڑا سبق آموز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) مجوزہ میڈیکل کالج کے چندہ کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کان پور پہنچے۔ وہاں چندہ کی مہم کے دوران ایک تاجر نے پوچھا ”آپ کو اپنے میڈیکل کالج کے لئے سب سے زیادہ چندہ کس طبقہ سے ملا“ ڈاکٹر ضیاء الدین نے بتایا کہ تاجروں سے۔ تاجر نے کہا: جب قومی منصوبوں میں زیادہ تعاون آپ کو تاجروں سے ملتا ہے تو قوم کو تجارتی ترقی کی راہ پر لانے کے لئے آپ اپنی یونیورسٹی میں تجارتی تعلیم کا شعبہ کیوں نہیں کھولتے۔ اس واقعہ سے سابق وائس چانسلر کو احساس ہوا اور واپس آکر انھوں نے اس کی کوشش شروع کی یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں پہلی بار مسلم یونیورسٹی میں کامرس کا شعبہ کھولا گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر صرف جزئی طور پر صادق آتا ہے۔ مگر ہماری عام قیادت کی وہ مکمل تصویر ہے۔ ہمارے لیڈروں کا یہ حال ہے کہ ان کی ساری بنیاد قومی چندہ پر قائم ہے۔ وہ آئے دن قوم سے چندہ مانگنے کے لئے نئی نئی اسکیمیں لے کر اٹھتے رہتے ہیں۔ مگر یہ لیڈر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو چندہ دینے کے قابل بنانے کے لئے بھی ان کے درمیان کوئی منصوبہ چلائیں اور اس کے لئے جدوجہد کریں۔

کسی منصوبہ کی کامیابی سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قوم کو اس کے لئے تیار کیا جاچکا ہو۔ اگر آپ ”مسلمانوں کا انگریزی اخبار“ وجود میں لانا چاہتے ہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہو جو انگریزی میں اخبار کے مطالعہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک مسلم یونیورسٹی حقیقی معنوں میں مسلم یونیورسٹی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ آپ مسلم نوجوانوں میں محنت اور جدوجہد کا اتنا حوصلہ پیدا کردیں کہ وہ امتیازی لیاقت پیدا کرکے مسلسل اس پر اپنا قبضہ باقی رکھ سکیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اردو زبان باقی رہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ عوام میں اردو لٹریچر کی طلب اتنی بڑھ جائے کہ خود اپنے بل پر اس کے تحفظ کا انتظام ہوجائے۔

یہی معاملہ ملی تعمیر کے تمام شعبوں کا ہے۔ اگر آپ ملت کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے فرد کو اٹھانے کا انتظام کیجئے۔ اگر آپ ملی ترقی کے لئے کوئی اقدام کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے ابتدائی سطح پر ضروری تیاریاں کرلیجئے۔ ”چھت“ والے آپ اسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ ”بنیاد“ کی سطح پر آپ نے اپنے حصہ کا کام پورا کرلیا ہو ——

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تاریخ کا مشترک عنوان قائم کرنا ہو تو وہ صرف ایک ہوگا: بے فائدہ سیاست

● صلاحیتیں جو سیاست کی نذر ہو گئیں

مولانا شبلی نعمانی کی کوششوں سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی پہلی عمارت بنی تو مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اس کی صدارت کے لئے سید رشید رضا مصری کو بلایا۔ رشید رضا نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی جو ڈھائی گھنٹہ تک جاری رہی۔ تقریر کے ترجمہ کے لئے پہلے سے کسی کو تیار نہیں کیا گیا تھا۔ آخر میں مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر کہا "کون اس تقریر کا اردو ترجمہ کرے گا" مولانا ابو الکلام آزاد اس وقت ڈائس پر موجود تھے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھایا۔ مولانا شبلی نے یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ مولانا آزاد نے ڈھائی گھنٹہ کی اس عربی تقریر کا ترجمہ ڈھائی گھنٹہ میں کیا۔ ان کے حافظہ نے ٹیپ ریکارڈ کی طرح پوری تقریر کو محفوظ کر لیا تھا اور انھوں نے مسلسل اس کو اپنی زبان میں بیان کر دیا۔

● آخرت کے بجائے سیاست

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ – ۱۸۷۲) ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک اردو مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کو ایک اردو کتاب پڑھنے کو ملی۔ یہ مولانا محمد لکھنوی کی احوال الآخرت تھی۔ اس کتاب نے ان کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ انھوں نے بار بار اس کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۸۸۷ میں اسلام قبول کر لیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جس کو آخرت کے احوال نے اسلام کی طرف کھینچا تھا، وہ اپنی تمام عمر لوگوں کو سیاست کے احوال بتانے میں مشغول رہا۔ یہاں تک بہتر سال کی عمر میں اس دنیا سے چلا گیا۔

● غیر پختہ نوجوان ان کی تحریک کا سرمایہ تھے

انیسویں صدی کے ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خلاف جن لوگوں نے سیکولر قومی تحریک چلائی، وہ بعد کو انجمن اتحاد و ترقی کی صورت میں منظم ہو گئے۔ کمال اتاترک (۱۹۳۸ – ۱۸۸۱) اس کے لیڈر تھے۔ خالدہ ادیب خانم اس انجمن کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں :

> "اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے۔ ابتدا میں ان میں ایک شخص بھی نہ تھا جو اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب تھے اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں" (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش)

خالدہ ادیب خانم نے جو بات ترکی کے بارے میں لکھی ہے، وہی موجودہ زمانہ کی اکثر مسلم تحریکوں پر صادق آتی ہے۔

جذباتی نہ بنو

۱۹۸۲ کے آخر میں دہلی میں ایشیائی کھیلوں کے مقابلے ہوئے جن کو عام طور پر ایشیاڈ (ASIAD) کہا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں مجموعی طور پر انڈیا نے تیرہ سونے کے میڈل حاصل کئے اور پاکستان نے صرف تین۔ مگر خود انڈیا اور پاکستان کے درمیان یکم دسمبر ۱۹۸۲ کو جو مقابلہ ہوا اس میں پاکستان کے مقابلہ میں ہندستانی ٹیم بری طرح ہار گئی۔ یہ دونوں کے درمیان ہاکی فائنل کا مقابلہ تھا اور انڈیا ایک اور سات کے تناسب سے پاکستانی ٹیم سے ہار گیا۔

ایشیاڈ کے تمام کھیلوں کے مقابلہ میں یکم دسمبر کا یہ کھیل سب سے زیادہ ہندستانیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس دن غیر معمولی زور و شور رہا۔ چنانچہ جب نتیجہ سامنے آیا تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں نے خوب خوب تبصرے کئے۔ ان تبصروں میں ایک تبصرہ خاص طور پر بہت سبق آموز تھا۔

ایوننگ نیوز (۲ر دسمبر ۱۹۸۲) نے کل کے دن کیا غلطی ہوئی (What went wrong yesterday) کے عنوان سے ایک رپورٹ چھاپی تھی۔ اس میں رپورٹر نے بہت سے ہندستانیوں کے تبصرے درج کئے تھے۔ ایک سینئر جرنلسٹ کے حوالے سے یہ جملہ نقل کیا گیا تھا:

> Whenever Indians play against Pak they
> are all nerves and this affects their game.

جب بھی ہندستان والے پاکستانیوں سے کھیلتے ہیں تو وہ بالکل جذباتی ہو جاتے ہیں اور یہ چیز ان کے کھیل کو متاثر کرتی ہے۔

کامیابی ہمیشہ اس کا نام ہوتی ہے کہ آدمی اپنی عقل کو بخوبی طور پر کام میں لائے۔ مگر جب آدمی کسی معاملہ میں جذباتی ہو جائے تو اس کے جذبات اس کی عقل پر چھا جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔ اور مقابلہ کی اس دنیا میں عقل کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے ہی کا دوسرا نام ناکامی ہے۔

اگر آج کسی سے آپ کو تکلیف پہنچے تو سوچ سمجھ کر کل اس کا جواب دیجئے۔ کسی کی ایک کارروائی سے آپ کے اندر غصہ پیدا ہو تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے اور اس کے بعد اس کے مقابلہ کے لئے اٹھئے۔ کوئی شخص آپ کو حقیر معلوم ہو تو اپنے ذہن میں اس کو برابر کی سطح پر لائیے اور پھر اس کے خلاف کارروائی کیجئے —— یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

عبرت ناک

قاضی نذرالاسلام بنگلہ زبان کے مشہور شاعر تھے۔ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کو جب نوبل انعام ملا تو نذرالاسلام نے ان کو مبارک باد کا خط بھیجا۔ اس کے جواب میں ٹیگور نے جو خط لکھا تھا وہ ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔ اس میں ٹیگور نے نذرالاسلام کو لکھا : نوبل انعام کے اصل مستحق تم تھے، میں نہیں۔

نذرالاسلام نہایت پرجوش انقلابی شاعر تھے۔ وہ آزادی کی حمایت میں اور انگریزی استعمار کے خلاف شعلہ بار نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے نوجوانوں میں آزادی کے جذبات بھڑکتے تھے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے نذرالاسلام کو گرفتار کر کے رانچی کے جیل میں قید کر دیا۔ وہاں ان کو جس کمرہ میں رکھا گیا وہ قلم، سیاہی اور کاغذ جیسی چیزوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کے لئے بظاہر ناممکن بنا دیا گیا کہ وہ کچھ لکھ سکیں۔

قاضی نذرالاسلام کے دماغ میں آزادی کے ترانے ابلتے تھے مگر وہ اپنے قید کے کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے تھے جس سے وہ ان کو لکھ سکیں۔ بالآخر انھوں نے یہ کیا کہ شیو بنانے کے بلیڈ سے اپنی انگلی کو زخمی کیا جس کے نتیجہ میں انگلی سے خون جاری ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنی انگلی کو قلم بنایا اور خون کو روشنائی اور پھر جیل کی دیواروں پر آزادی کے اشعار لکھ ڈالے۔

غالبا یہی واقعہ ہے جس کے بارے میں فیض احمد فیض نے اپنا شعر کہا :

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے   کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ مگر یہ تمام قربانیاں حقیقۃً قوم اور وطن اور سیاست کی راہ میں تھیں۔ اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کے لئے انھوں نے اپنے خون کو روشنائی بنا ڈالا۔ اور قومی مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے جان ومال کو لٹا دیا۔ مگر پوری جدید تاریخ میں کوئی بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے دعوت کی راہ میں اپنے آپ کو ہلکان کیا ہو۔

مسلمان کا اصل مقصد اقوام عالم تک خدا کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اسی ایک کام کو نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں ان کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔ یہی واحد سب سے بڑی کوتاہی ہے جس کی بنا پر مسلمان موجودہ زمانہ میں خدا کی نصرت کے مستحق نہ ہو سکے۔

خبر غلط تھی

نیل آرم اسٹرانگ مشہور امریکی خلاباز ہیں ۔ وہ تاریخ کے پہلے انسان ہیں جنہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو چاند پر قدم رکھا ۔ وہ اس سے پہلے امریکہ کے خلائی ادارہ ناسا (NASA) سے متعلق تھے ۔ اب اس سے الگ ہوکر وہ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں ۔

پچھلے دنوں ملیشیا کے اخبار اسٹار (۱۰ جنوری ۱۹۸۳) اور سری لنکا کے ڈیلی نیوز پیپر (۲۹ جنوری ۱۹۸۳) میں ایک خبر چھپی جو بہت جلد دوسرے مسلم اخبارات میں نقل ہوکر دنیا بھر میں پھیل گئی ۔ یہاں ہم اسٹار کی خبر اور اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں :

دنیا کے مشہور خلاباز آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنہوں نے چاند پر قدم رکھا ۔ وہ اس کے بعد سے مسلمان ہو گئے ہیں اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جب پہلی بار انہوں نے چاند پر قدم رکھا تو انہوں نے وہاں ایک آواز سنی جو ان کے لئے اور ان کے ساتھیوں کے لئے بہت صاف تھی ۔ اس وقت ان کو خیال آیا کہ ان کے کانوں کو دھوکا ہو رہا ہے ۔ کیوں کہ اس وقت وہ چاند کو پہلی بار دیکھ رہے تھے ۔ اور ان پر ایک استعجاب کی کیفیت طاری تھی ۔ بعد میں وہ مختلف ملکوں میں لیکچر دینے کے لئے گئے ۔ اس دوران وہ قاہرہ (مصر) بھی گئے ۔ وہاں انہوں نے وہی آواز دوبارہ سنی جو انہوں نے چاند پر سنی تھی ۔ انہوں نے اپنے قریب کے مصری ساتھی سے پوچھا کہ یہ آواز کیا ہے ۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ اذان ہے جو عبادت کی پکار ہے اور اس میں خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے ۔ آرم اسٹرانگ کو بہت تعجب ہوا ۔ کیونکہ یہ ان کے حافظہ کے مطابق وہی آواز اور وہی الفاظ تھے جو انہوں نے چاند پر سنے تھے ۔ اس وقت انہوں نے اسلام کے متعلق جاننے کا

فیصلہ کیا اور بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی قابل رشک ملازمت کھو دی۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ میں نے خدا کو پا لیا ہے۔ اور اب کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

یہ خبر دوسرے اخبارات میں نقل ہوئی تو اس میں مزید اضافے بھی کر دئے گئے۔ مثلاً یہ کہ آرم اسٹرانگ نے چاند کی آواز کو ٹیپ ریکارڈ کر لیا تھا اور زمین پر آ کر اذان کی آواز کو اس سے ملایا۔ وغیرہ۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک خط مسٹر آرم اسٹرانگ کو لکھا تھا۔ انہوں نے اس خبر کی تردید کی ہے اور اس کو بے بنیاد بتایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ذاتی دستخط سے جو جواب موصول ہوا ہے اس کا عکس علٰحدہ صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔ آرم اسٹرانگ اپنے جواب میں لکھتے ہیں:

آپ کے خط کا شکریہ۔ میرے اسلام قبول کرنے کی خبریں، اذان کی آواز کو چاند پر اور اس کے بعد قاہرہ میں سننا، سب خلاف واقعہ ہیں۔ میں کبھی مصر نہیں گیا۔ ملیشیا، انڈونیشیا اور دوسرے مقامات کے کچھ رسالوں اور اخبارات نے یہ خبریں بغیر تصدیق کئے ہوئے چھاپی ہیں۔ اس نااہل صحافت نے آپ کو جو بھی زحمت دی ہو اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں ——

خلوص کے ساتھ، آرم اسٹرانگ

خبر کے مطابق اس واقعہ میں حکومت امریکہ بھی ملوث تھی۔ کیونکہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مسٹر آرم اسٹرانگ کی سرکاری ملازمت ختم کر دی گئی ہے۔ اس بنا پر خود حکومت امریکہ نے بھی اس کی تردید کا اہتمام کیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے امریکن سینٹر میں ایک خصوصی ٹیلی پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اخبارات کے نمائندوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ٹیلی فون کے ذریعہ براہ راست آرم اسٹرانگ سے بات کریں۔ اس ٹیلی پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے امریکی خلاباز نے اپنے قبول اسلام کی تردید کی (ہندستان ٹائمس ۱۳ مئی ۱۹۸۳) مزید انہوں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات کبھی ان کے سامنے نہیں آئیں اور نہ انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے:

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے آرم اسٹرانگ اور ان جیسے دوسرے بندگان خدا کے سلسلہ میں اپنی تبلیغی ذمہ داریوں کو تو پورا نہیں کیا۔ البتہ فرضی کہانیاں بنا کر خوش ہو رہے ہیں کہ چاند سے لیکر امریکی خلاباز تک سب کو ان کے دین اعظم نے فتح کر رکھا ہے۔

نظام تعلیم

چارلس ایڈمس ایک امریکی عیسائی تھے۔ انھوں نے مصر میں رہ کر وہاں کی اسلامی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے :

Islam and Modernism in Egypt

اس کتاب میں ایک جگہ وہ جامعہ ازہر (قاہرہ) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "روایت پرستی کی روح صدیوں سے جامعہ ازہر کی تعلیمی سرگرمیوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ علمی تحقیق اور چھان بین کے ذریعہ متعلقہ علوم کو ترقی دی جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قدماء کا ذہنی سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہے، بعینہ اسی حالت میں جیسا کہ اسلاف نے اپنے بعد والوں کو دیا تھا۔ آزادانہ تحقیق اور آزادانہ رائے قائم کرنے کا دروازہ اسلام میں تیسری صدی ہجری سے بند ہے۔ اس لئے مذہب کے مستند شارحین صرف دور ماضی میں ملتے ہیں اور بعد والوں کے لئے صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ کی شرح کرتے رہیں۔"

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مصر کی جامعہ ازہر میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مصنف کا تبصرہ اب اس پر صرف جزئی طور پر ہی صادق آتا ہے۔ تاہم ہندستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے اسلامی مدارس کے لئے یہ الفاظ آج بھی پوری طرح درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیم کا معاملہ عام سیکولر تعلیم سے مختلف ہے۔ سیکولر تعلیم مطلق طور پر آزادانہ تحقیق کی قائل ہے۔ جب کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہمیشہ قرآن و سنت پر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے مدارس میں آج جو تعلیم دی جارہی ہے اس کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر نہیں بلکہ ایک خاص دور میں پیدا ہونے والے کتاب و سنت کے شارحین پر ہے۔ کتابوں کی ایک خاص فہرست ہے جن کو مقدس مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب قرآن و حدیث بھی انھیں کتابوں کی روشنی میں پڑھائے جاتے ہیں نہ کہ ان کتابوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھایا جائے۔

اس طرز تعلیم کا براہ راست نتیجہ جمود اور تنگ نظری ہے۔ یہ جمود اور تنگ نظری آج مسلم قوم کا سب سے بڑا خاصہ بن چکی ہے اور ہم اس کے وہ تمام نتائج بھگت رہے ہیں جو ایسی ذہنیت سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

کیسی عجیب غفلت

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴) ایک نومسلم تھے۔ وہ پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن سے غیر معمولی ذہین تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام "عبید اللہ" اس لئے رکھا کہ وہ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس کتاب سے متاثر ہوئے وہ "تحفۃ الہند" تھی جس کے مصنف کا نام "عبید اللہ" ہے۔

اس کتاب میں اسلام کا تقابل دوسرے مذاہب سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سکھ مذہب اور ہندو دھرم سے غیر مطمئن ہو گئے۔ اس کتاب نے ان کے اندر اسلام کی طرف ابتدائی رجحان پیدا کر دیا۔ تاہم ابھی وہ قطعی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ بعد کو انھوں نے بتایا کہ "میں سوچتا تھا کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے۔ مگر مسلمان اپنے بزرگوں کی قبروں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے"۔ یہ سوال ان کے لئے اسلام قبول کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اپنے دل کی یہ کھٹک انھوں نے کچھ مسلمانوں سے بیان کی۔ چنانچہ ایک مسلمان نے انھیں شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" دی اور اس کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کا موضوع شرک کی مختلف صورتوں کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ انھوں نے جب اس کتاب کو پڑھا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسلام توحید خالص کا دین ہے۔ انھوں نے جانا کہ مسلمانوں کی قبر پرستی مسلمانوں کے اپنے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ قبر پرستی کا بھی ویسا ہی مخالف ہے جیسا وہ بت پرستی کا مخالف ہے۔

ان دو کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کا نظریاتی سفر بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ تاہم آبائی مذہب کو چھوڑ کر نئے مذہب کی طرف بڑھنے کے لئے جس طاقت ور محرک کی ضرورت ہے وہ ابھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ایک اور کتاب کے مطالعہ سے انجام پا گیا۔ یہ "احوال الآخرت" تھی۔ اس کتاب میں قیامت کی ہولناکی اور جنت دوزخ کی باتیں درج ہیں۔ پچھلی کتابوں کے مطالعہ سے اگر ان کا دماغ ہلا تھا تو آخری کتاب کے مطالعہ سے ان کا دل ہل گیا اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔

یہ تینوں کتابیں جن کا ذکر ہوا وہ اردو کتابیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۰ سال یا ۱۰۰ سال پہلے کے ہندستان میں یہ ممکن تھا کہ اردو زبان کو غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ کیسا عجیب اور کیسا قیمتی امکان تھا جس کو ہمارے تمام اصاغر و اکابر نے بے فائدہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو دیا۔ قانون قدرت کے مطابق اس کی سزا ہمیں یہ ملی ہے کہ اب غیر مسلموں میں دین پہنچانے کے لئے ہمیں کئی اجنبی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کرنا ضروری ہوگیا ہے اور اردو زبان کا یہ حال ہوا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار اب خود مسلم نسلوں تک بھی اس کے ذریعہ دین کا پیغام پہنچانا ممکن نہیں۔ جو کام پہلے صرف ایک زبان کے ذریعہ ہو سکتا تھا اس کے لئے اب ہم کو کئی زبانیں کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی جدوجہد کا کم از کم ایک نمایاں عنوان اردو رہا ہے۔ اردو کے خاتمہ کا مرثیہ پڑھنا ہمارے تمام لیڈروں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جب آزادی ہند سے پہلے ملک کی سب سے زیادہ عام زبان اردو تھی تو آزادی ہند کے بعد وہ یہاں اجنبی کیسے بن گئی۔

زبان ان چیزوں میں سے ہے جس کا تسلسل اگر تاریخ میں ایک بار قائم ہو جائے تو اس کو توڑنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ تسلسل قائم ہونے کے بعد وہ خود اپنے زور پر قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بہت بڑا اجتماعی بھونچال ہی اس کو توڑ سکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں اس کا تسلسل تاریخ میں جاری رہے گا۔ وہ ختم نہیں ہو سکتا۔

ہندستان میں اردو کے خاتمہ کے واحد ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں دو قومی سیاست چلائی اور اس کو اس اجتماعی بھونچال تک لے گئے جس کا دوسرا نام تقسیم ہے۔ تقسیم ملک کا بھونچال ہی دراصل وہ واقعہ ہے جس نے اردو کے تسلسل کو ہندستان میں ختم کر دیا۔ اگر مسلمانوں کی احمقانہ سیاست سے یہ بھونچال پیش نہ آتا تو ناممکن تھا کہ اس ملک میں اردو کا اس طرح خاتمہ ہو جائے جو آج ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔

اس کی ایک مثال ہندستان کی فلمی صنعت ہے۔ ہندستانی فلموں کی دنیا میں اردو زبان آج بھی زندہ ہے جب کہ ملک کے بقیہ حصہ میں وہ موت سے دوچار ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”فلم“ کی حیثیت ہر ملک میں اور اسی طرح ہندستان میں بھی، ایک جزیرہ کی ہے۔ فلم کی دنیا عام طور پر سیاسیات اور قومی ہنگاموں سے الگ الگ زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی فلموں کے جزیرہ میں اردو آج بھی، پہلے کی طرح، زندہ ہے۔ جب کہ بقیہ ملک میں وہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکی ہے۔

آہ یہ بے شعوری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کا ایک اخباری رپورٹر علی گڑھ پہنچا اور اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو میں مذکورہ پروفیسر نے یونیورسٹی کے اندرونی نظام کی بعض خرابیوں کا ذکر کیا جس کے نتیجہ میں وہاں ہنگامہ پسند لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعلیمی معیار مسلسل گر رہا ہے۔ یہ انٹرویو چھپا تو یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ مشتعل ہو گئے اور یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور ادھم بازی شروع کر دی۔ حالاں کہ ان کا پُرتشدد ردعمل صرف یہ ثابت کر رہا تھا کہ پروفیسر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر موجود ہیں۔

مسلم صحافت اور قیادت نے حسب معمول اس معاملہ میں طلبہ کا ساتھ دیا۔ مسلم اخبارات نے اس انٹرویو کو انتہائی قابل اعتراض (۱۶ مئی ۱۹۸۱) قرار دے کر اس کے خلاف پرشور مضامین لکھے۔ مگر اردو یا انگریزی کے کسی بھی اسلام پسند اخبار نے انٹرویو کے اصل الفاظ شائع نہیں کئے۔ جن لوگوں نے اصل انٹرویو کو انڈین اکسپرس میں پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اس یک طرفہ لفظی طوفان کی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ مسلم اخبارات اصل انٹرویو شائع کر دیتے تو قارئین پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ وہ یقینی طور پر "انتہائی قابل اعتراض،، نہیں تھا۔ وہ بس ایسا ہی تھا کہ یا تو اس کو نظرانداز کر دیا جاتا یا اس کے جواب میں ایک وضاحتی مضمون مرتب کر کے شائع کر دیا جاتا ———

یہ ہے ہماری وہ غیر عادلانہ سیاست جس پر ہم یقین کئے بیٹھے ہیں کہ خدائے عادل ہمارے اوپر اپنی نصرتوں کی بارش برسائے گا۔

اس قسم کے لایعنی ہنگاموں کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کے طلبہ کے یہ ہنگامے جو اسلام کے نام پر کئے گئے ان پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے تین قسطوں میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ مسٹر جے۔ ڈی سنگھ نے اپنی اس رپورٹ میں جو باتیں کہی ہیں ان میں سے ایک بات ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> Why do the AMU students raise the cry of 'Islam in danger' at the slightest pretext ? Is Islam which has withstood major onslaughts on it in the past, become so fragile as to be seen to crumble before a mere newspaper article by a marxist.

ایسا کیوں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ انتہائی معمولی باتوں کو لے کر "اسلام خطرہ میں،، کی چیخ پکار بلند کرنے لگتے ہیں۔ اسلام جو ماضی میں اپنے اوپر بڑے بڑے حملوں کے مقابلہ میں قائم رہا کیا اب اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک اخبار میں کسی مارکسسٹ کا محض ایک مضمون چھپ جانے سے وہ منہدم ہوتا ہوا نظر آنے لگے (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ مئی ۱۹۸۱)

اس سے اندازہ کیجئے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے علم بردار کس طرح اسلام کے نادان دوست ثابت ہوئے ہیں

مسلم یونیورسٹی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے جس میں ان تمام سرگرمیوں کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے. جو ہمارے یہاں ملّت کے نام پر جاری ہیں۔ نیز اسی مثال سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری ملی سرگرمیاں اپنی ساری دھوم کے باوجود اس قدر ناکام کیوں ہیں۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ ایجی ٹیشن پروفیسر عرفان حبیب کے ایک انٹرویو کے نام پر شروع کیا گیا۔ اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اس انٹرویو کو انگریزی میں مکمل طور پر پڑھا ہے۔ زیادہ تر لوگ بس سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس کے خلاف مجاہد بنے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن کے اس حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے کہ:

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأٍ	اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر آئے
فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا	تو اس کی تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم پر نادانی سے
علیٰ ما فعلتم نادمین (حجرات ۶)	جا پڑو پھر اپنے کئے پر تم کو پچھتاوا ہو

۲۔ پروفیسر موصوف نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف ایک اخباری مضمون کی اشاعت تھی۔ مگر اس کے جواب میں جو کچھ کیا گیا وہ مارپیٹ، ہنگامہ اور توڑ پھوڑ تھا۔ یہ بھی قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی کہ:

والذین اذا اصابہم البغی ہم ینتصرون و	اور وہ لوگ کہ جب ان پر سرکشی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے
جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا (شوری ۴۰)	ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی

۳۔ پروفیسر موصوف کا انٹرویو یونیورسٹی کے نظم ونسق کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک عام تعلیمی بات تھی مگر اس کو غلط طور پر اسلام اور کفر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ اپنی دنیوی سیاست کے لئے دین کا نعرہ استعمال کرنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے:

ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا (بقرہ ۴۱)	اور میری آیتوں پر تھوڑی پونجی نہ خریدو

۴۔ پروفیسر موصوف نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی میں انتظام اور تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ خاموش تعمیری جدوجہد کے ذریعہ انتظام اور تعلیم کے معیار کو بلند کر دیا جاتا۔ یہ مذکورہ بیان کی نہایت کامیاب تردید ہوتی۔ اس کے برعکس شور وغل اور ہنگامہ بازی شروع کر دی گئی۔ یہ قرآن کے الفاظ میں ایسے کام کا کریڈٹ لینا تھا جس کو آدمی نے کیا نہیں۔ یہ حضرات اپنے آپ کو یونیورسٹی کے خادم کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔ حالانکہ یونیورسٹی کی جو اصل خدمت تھی اس کو انھوں نے انجام ہی نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کو قرآن کے اس انتباہ سے ڈرنا چاہئے:

لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان	جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو
یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنہم بمفازۃ من العذاب	کچھ نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو تو ان کو تم عذاب سے
ولہم عذاب الیم (آل عمران ۱۸۸)	بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

وہ مواقع جو استعمال نہ ہو سکے

فریڈرک ٹوکر (۱۸۵۲-۱۹۲۹) ایک انگریز آئی سی ایس تھا۔ وہ کمشنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ اس کے اندر مذہبی اور روحانی جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انگلستان میں اس وقت جنرل ولیم بوتھ کے تحت سالویشن آرمی (نجات دہندہ فوج) کی تحریک چل رہی تھی۔ اس نے جنرل بوتھ کو آمادہ کیا کہ اس تحریک کی ایک شاخ ہندستان میں قائم کی جائے۔ چنانچہ ۱۹ر ستمبر ۱۸۸۲ء کو اس کی پہلی شاخ بمبئی میں قائم ہوئی۔

فریڈرک ٹوکر (Frederick Tucker) نے اپنا نام فقیر سنگھ رکھ لیا۔ وہ پنجاب کے دیہاتوں میں ننگے پاؤں گھومتا اور لوگوں کو روزگار پر لگانے کی کوشش کرتا۔ اس نے دیہی بنک قائم کئے۔ گھریلو صنعتیں رائج کیں اور کالونیاں بنائیں، وغیرہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ مارچ ۱۹۲۹)

"استعمار" کے زمانہ میں اس طرح کے بہت سے انگریز تھے جن کی فطرت زندہ تھی اور جن کے اندر دین حق کا بیج ڈالا جا سکتا تھا۔ مگر تمام قائدین سیاسی ہنگاموں میں لگے رہے۔ خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کی ضرورت کسی کو محسوس نہ ہوئی۔ اس قسم کے لوگ اگر آخرت میں کہیں کہ خدایا ہم حق کی تلاش میں تھے۔ مگر حق کے امانت داروں نے ہم کو حق سے آشنا نہیں کیا۔ وہ تو ہم سے صرف سیاسی لڑائی لڑتے رہے تو مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے قائدین کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

یہ ان مواقع کی ایک مثال تھی جو انفرادی اعتبار سے ہمارے لئے پیدا ہوئے۔ حالیہ زمانے میں اسی قسم کے مواقع اجتماعی سطح پر بھی بار بار سامنے آئے۔ مگر مسلمان ان سے کوئی دعوتی فائدہ حاصل نہ کر سکے

خاندان ہیپس برگ (Hapsburgs) ایک زمانہ میں آسٹریا و ہنگری پر حکومت کرتا تھا۔ ترکی کے سلطان سلیمان اعظم (۱۵۲۰-۱۵۶۶) کے زمانہ میں اس کے تخت پر شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V) حکمراں تھا۔ اس وقت وہ یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تسلیم کیا جاتا تھا۔ یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر اس کی سلطنت پھیل چکی تھی۔

اس حکومت کے تعلقات فرانس سے اچھے نہ تھے۔ فرانس کی یہ کوشش تھی کہ اس وسیع سلطنت کو مغرب کی سمت بڑھنے سے روکے۔ اسی طرح مشرق میں عثمانی سلطنت ہیپس برگ حکمرانوں کے لئے سد راہ بنی ہوئی تھی۔ فرانس نے محسوس کیا کہ وہ اور سلطنت عثمانیہ دونوں ہیپس برگ کے مشترک حریف ہیں۔ اس نے اپنے محاذ کو مضبوط کرنے کے لئے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات بڑھانا چاہا ــــ چنانچہ فرانس کی حکومت نے ۱۵۳۴ میں اپنے سفیر کو قسطنطنیہ بھیج کر خود ہی اس کی طرف پہل کی۔ دونوں میں اچھے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک سال بعد جب شاہ فرانس (Francis I) اور شاہ چارلس پنجم میں جنگ چھڑی تو فرانس نے سلطان سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان سلیمان نے اس جنگ میں نہ صرف فرانس کی فوجی مدد کی بلکہ اس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ بھی کر لیا۔ اس معاہدہ کے مطابق فرانسیسیوں کو صرف پانچ فی صد محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ فرانسیسی تاجروں کے

دیوانی و فوجداری مقدمات ان کے اپنے قونصل کے سپرد کر دئے گئے۔ ان کو ترکی میں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور ترکی میں واقع عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کی نگرانی بھی ان کا حق تھا۔ اس دوستانہ معاہدہ کی وجہ سے فرانس اور ترکی کے تعلقات تقریباً تین صدیوں تک بہت خوش گوار رہے۔ ان تعلقات سے فرانس میں بہت بڑے پیمانہ پر تبلیغ کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا۔ مگر اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا جاسکا۔

اسی طرح ترکی اور روس قدیم زمانہ میں ایک دوسرے کے روایتی حریف تھے۔ اگست ۱۹۱۴ میں جب یورپ کی عالم گیر جنگ چھڑی تو ایک طرف روس، برطانیہ اور فرانس تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کمال اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ ترکوں کو اس جنگ سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ اس وقت ترکی کے اقتدار پر انور پاشا اور ان کے پرجوش ساتھیوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے روس اور برطانیہ کی دشمنی میں جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شرکت نے اتحادیوں کے لئے سخت دشواریاں پیدا کر دیں۔ ترکوں نے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کو دشمن کے جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ اس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہوگیا۔ روس اس وقت ایک غیر صنعتی ملک تھا اس لئے جب تک برطانیہ اور فرانس کے کارخانوں سے اس کو کافی مقدار میں سامان جنگ فراہم نہ ہوتا رہے وہ جدید طرز کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ تاہم ترکی کے لئے یہ پالیسی بہت مہنگی پڑی۔ جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے بعد ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا قسطنطنیہ کے تخت پر اگرچہ برائے نام سلطان باقی رہا مگر عملاً ترکی کے تمام معاملات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے —— یہ سب کچھ ہوا۔ مگر جرمنی سے اتنے لمبے قریبی تعلق کے باوجود جرمنی میں تبلیغ اسلام کا کوئی کام نہ کیا جاسکا۔

اس قسم کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کی مثالیں مسلم حکومتوں کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گی۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں جب کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد کی خاطر کسی سے اتحاد کیا گیا ہو۔ یا سیاسی اتحاد کے ذریعہ پیدا شدہ حالات سے دعوتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اگر دعوتی مزاج ہوتا تو اس قسم کے اتحاد سے غیر معمولی دعوتی فائدے حاصل کئے جاسکتے تھے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانوں کے باہمی تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مگر تعلقات میں اضافہ کا یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکا کہ مسلمان نئے مواقع کو دوسرے لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے میں استعمال کرتے۔ انفرادی روابط اور قومی تعلقات دونوں ہی اس قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ حال تھا کہ وہ ربط و تعلق کے ہر موقع کو دعوت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مگر آج مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں صرف دو باتوں کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں۔ معاشی فائدہ حاصل کرنا یا سیاسی جھگڑے کھڑے کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ حقوق طلبی اور قومی محاذ آرائی کا۔ مسلمان اپنی لڑائی جھگڑے کی سیاست سے دوسری قوموں کو اسلام سے متوحش کرنے کا کام تو بہت بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں مگر ان کو اسلام کے قریب لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ■

کیسا عجیب

گاندھی جی کی مشہور شاگرد میرا بہن ایک انگریز خاتون تھیں، جن کا اصل خاندانی نام میڈلین سلیڈ (Madeleine Slade) تھا۔ وہ سرایڈمنڈ سلیڈ کی لڑکی تھیں۔ ان کو اپنے لئے ایک "زندہ خدا" کی تلاش تھی۔ ابتداءً انھوں نے مشہور موسیقار بیتھوون میں اپنی اس تلاش کا جواب پایا۔ تاہم ان کی فطرت اس پر پوری طرح مطمئن نہ تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات مشہور فرانسیسی مفکر رولینڈ رولاں سے ہوئی۔ رولینڈ رولاں گاندھی جی سے بہت متاثر تھا، اس نے مس سلیڈ سے کہا، "کیا تم نے گاندھی جی کے بارے میں نہیں سنا"۔ مس سلیڈ نے کہا۔ "نہیں" رولینڈ رولاں نے کہا "وہ دوسرے مسیح ہیں"۔

He is another Christ

اس کے بعد مس سلیڈ نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی اتنی گرویدہ ہوئیں کہ اپنا وطن چھوڑ کر مستقل طور پر ہندستان آنے کے لئے تیار ہوگئیں۔

یہ ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے مس سلیڈ نے سمندری جہاز پر اپنے لئے ایک برتھ رزرو کی تاکہ وہ جلد سے جلد ہندستان پہنچ سکیں۔ اس کے بعد اچانک انھیں خیال آیا کہ میں گاندھی جی کے ملک میں جارہی ہوں مگر میں گاندھی جی کے ملک کی زبان نہیں جانتی۔ انھوں نے ہندستان کی زبان کے بارے میں معلومات کیں تو انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کی عام زبان اردو ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان سیکھنے کے لئے اپنے سفر ہند کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا۔ وہ اس سے پہلے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں جانتی تھیں، انھوں نے دوبارہ محنت کر کے اردو سیکھی اور پھر ۱۹۲۵ میں ہندستان آئیں۔

گیٹا سرینی (Gitta Sereny) نے میرا بہن (سابق مس میڈلین سلیڈ) کے حالات لکھے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ دسمبر ۱۹۸۲) انھوں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> In the fall of 1924, four months into her training included learning Urdu and converting to vegetarianism.

۱۹۲۴ کی موسم خزاں کے چار مہینے مس سلیڈ کے لئے تربیتی مہینے تھے، ان میں اس نے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو سبزی خوری کا عادی بنایا —— پچاس سال پہلے ملک کی عام زبان اردو تھی۔ یہ دین کی عمومی اشاعت کا بہت بڑا موقع تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں نے لایعنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے یہ موقع ان سے چھین لیا۔ اب اردو کے ذریعہ یہاں نہ سیاست کا کام کیا جا سکتا ہے اور نہ اشاعت دین کا۔

فلسطین: ایک علامت

فلسطینی مسلمان ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن فلسطین سے بے گھر کئے گئے۔ اس کے بعد وہ اطراف کے علاقوں مصر اور شام اور اردن سے نکالے گئے۔ لبنان ان کا آخری مرکز تھا، اب ۱۹۸۲ء میں وہ یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ پچھلے ۳۵ سال سے ان پر جتنا ظلم ہو رہا ہے اتنا ظلم شاید اسلامی تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی مسلم گروہ پر نہیں ہوا۔

یہ معاملہ کوئی سادہ یا مقامی معاملہ نہیں۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس کا تعلق ساری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک انتباہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان بحیثیت مجموعی خدائی عتاب کی زد میں ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کا معاملہ اس کی ایک علامت ہے۔ خدا مسلمانوں کو رد کر چکا ہے۔ اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ان کے درمیان ایسے بزرگ موجود ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر کھڑے ہو کر یہ تقریر کر رہے ہیں کہ اکتشفت الامۃ العربیۃ نفسھا (عرب قوم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا) ان میں ایسے مفکرین اسلام موجود ہیں جو موجودہ عہد کو اسلام کا عہد بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کے درمیان آج اسلام کے نام پر اتنی سرگرمیاں جاری ہیں کہ وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ہم نے سارے عالم میں اسلام کی ہوائیں چلا دی ہیں۔

ظہور آیات کا مقام

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پچھلے انبیار کی نبوتیں عملی طور پر منسوخ ہو گئیں۔ اب صرف آپ کی نبوت خدا کی نظر میں مستند نبوت ہے اور صرف آپ کی پیروی سے کسی کو نجات مل سکتی ہے۔ پیغمبر اسلام کے ظہور کے ذریعہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کا ایک حسی مظاہرہ یا علامتی نمونہ دکھائے۔ چنانچہ اس کے لئے معراج میں یہ کیا گیا کہ سابقہ انبیار کو ایک مقام پر جمع کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کی ہدایت پر ان کی امامت فرمائی اور تمام انبیار نے آپ کی قیادت میں آپ کے پیچھے نماز ادا کی (وقد رأیتنی فی جماعۃ من الانبیار ۔ ۔ ۔ فحانت الصلوٰۃ فاممتھم، صحیح مسلم)

امامت انبیار کا یہ واقعہ کعبہ (عرب) میں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے لئے معراج ہوئی اور آپ کو بیت المقدس (فلسطین) لے جایا گیا۔ اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے —— تاکہ ہم پیغمبر کو اپنی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من آیاتنا، اسرار ۱) بیت المقدس تاریخی طور پر وہ مقام بن چکا تھا جہاں امت یہود کے سلسلہ کی خدائی نشانیاں پچھلے ہزاروں سال سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ اب معراج کے موقع پر

خود نبی آخرالزماں کو خدائی نشانی دکھانے کے لئے وہاں لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی وراثت اب آپ کی امت کو دے دی گئی۔ پھر جب بیت المقدس مسلمانوں کے حصہ میں آیا تو اس کی وہ دینی اور آیاتی حیثیت بھی انھیں کی طرف لوٹ آئے گی جو قدیم انبیا کے زمانہ میں انھیں حاصل تھی۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جب خدا کی رحمت ہوتی تو وہ فلسطین میں فارغ البال اور ذی اقتدار بنا دئے جاتے۔ اور جب ان پر خدا کا عتاب ہوتا تو فلسطین ان سے چھن جاتا اور وہ سخت مصیبتوں کی زد میں آجاتے۔ فلسطین بنی اسرائیل کے مرحوم یا معتوب ہونے کی علامت تھی۔ یہی معاملہ خدا کا اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین مسلمانوں کے حق میں حکم خداوندی کی علامت ہے۔ اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل ہو اور وہاں وہ امن کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ خدا ان سے خوش ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ عتاب خداوندی کی زد میں آگئے ہیں (احبار، باب ۲۶، استثنا، باب ۲۸)

نبی آخرالزماں کے ظہور کے بعد بیت المقدس اور کعبہ دونوں کی وراثت آپ کی امت کو دی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے امت مسلمہ کے بارہ میں مرحومیت یا معتوبیت کا اظہار کعبہ کی سطح پر بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کعبہ دین محفوظ کا قبلہ اور اس کا قیامت تک کے لئے مرکز ہے، اس لئے اس کو تخریبی فتنوں سے بچانا بھی ضروری ہے۔ کعبہ محفوظ نہ رہے تو دین کی محفوظیت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ امت مسلمہ کے بارے میں آیات رحمت یا آیات غیر رحمت کے ظہور کے لئے بیت المقدس کو بدستور اپنی سابقہ حیثیت پر باقی رکھا جائے۔

فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو امریکہ اور اسرائیل کی جارحیت سمجھنا خدا کی سنت سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ یہ دراصل خدا کا وہ معاملہ ہے جو وہ حاملین کتاب کے ساتھ اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ حامل کتاب ہونے کی ذمہ داری کو ادا نہ کر رہے ہوں۔ پہلے یہود کتاب الٰہی کے حامل تھے۔ اس لئے پچھلے زمانہ میں یہود کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا رہا۔ اب مسلمان کتاب الٰہی کے حامل ہیں، اس لئے اب خدا کا وہ معاملہ فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ ہوگا جو پہلے فلسطین کے یہود کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

پھر یہ کام یہود سے کیوں لیا جا رہا ہے، اس کی خاص مصلحت ہے۔ یہود کا فلسطین میں جمع ہونا اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو ذلت کی سزا دینا بیک وقت دو مقاصد کا حامل ہے۔ ایک طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو ایک مقام پر جمع کر کے بالآخر انھیں کوئی سخت اجتماعی سزا دی جانے والی ہے۔ دوسری طرف ایک "مغضوب،، قوم کے ذریعہ مسلمانوں کو سزا دینا اس شدتِ عتاب کو بتا رہا ہے جس کا مورد اس وقت

مسلمان بن رہے ہیں اور اس وقت تک بنتے رہیں گے جب تک وہ دوبارہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کی بنیاد پر کھڑا نہ کریں۔

آج تمام دنیا کے مسلمان فلسطینیوں کی حمایت پر متحد ہیں۔ شاید عالم اسلام کا دوسرا کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں جس پر ان کے درمیان اتنا زیادہ اتفاق پایا جاتا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کے تمام اصاغر و اکابر اس معاملہ میں یکساں طور پر امریکہ اور اسرائیل کی مذمت کر رہے ہیں اور مجاہدین فلسطین کے نام اپنے حمایتی الفاظ نشر کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح فلسطین کا مسئلہ، عملاً، تمام دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بن گیا ہے۔ فلسطینی مسلمانوں کی عزت تمام مسلمانوں کی عزت ہے اور فلسطینی مسلمانوں کی بے عزتی تمام مسلمانوں کی بے عزتی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عمومی حمایت کسی بھی درجہ میں فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ فلسطینی مسئلہ دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ کسی اور مقام پر پیدا ہوا ہے اور مسلمان اس کا حل کسی اور مقام پر تلاش کر رہے ہیں۔

یہ مسئلہ امریکہ اور اسرائیل کی سطح پر نہیں ہے بلکہ خدا کی کتاب کی سطح پر ہے۔ اگر یہ امریکہ کا مسئلہ ہوتا تو ہم اس کو اسی طرح حل کر چکے ہوتے جس طرح ویت نام نے اس کو بہت پہلے حل کر لیا۔ خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اور خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی کو ختم کر کے ہی یہ مسئلہ دوبارہ ختم ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ مزید اس بات کی علامت ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان جو کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے وہی وہ چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کو ان سے مطلوب ہو یا جو کتاب الٰہی کی اقامت کے ہم معنی ہو۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں اتنی بڑی بڑی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور اتنے بڑے پیمانہ پر اسلامی کام ہو رہے ہیں کہ اگر یہی وہ چیز ہوتی جو خدا کو مطلوب ہو تو کبھی ممکن نہ تھا کہ مسلمان عتاب خداوندی کی زد میں آئیں کیونکہ یہ سب کام مقدار میں اتنے زیادہ ہیں کہ اگر وہ صحیح اور مطلوب ہوں تو ان پر نصرت خداوندی کا نزول ہونا چاہئے نہ کہ عتاب خداوندی کا۔

یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر آج تمام دنیا کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ خدا اگر انھیں رد کر دے تو پھر ان کے لئے نہ دنیا میں کوئی جگہ ہے اور نہ آخرت میں۔ غیر مطلوب سرگرمیاں، خواہ وہ دین کے نام پر کی جا رہی ہوں، کسی کو خدا کی نظر میں رحمت و نصرت کا مستحق نہیں بناتیں۔

اسلام کے نام پر اسلام کا قتل

یوروا کارتا (انڈونیشیا) کے مسلم اسکول میں طالب علموں نے ایک تصویری پوسٹ کارڈ چھپوایا۔ اس میں ایران کے مذہبی قائد آیات اللہ خومینی کی تصویر تھی۔ پوسٹ کارڈ کی تقسیم سے پہلے حکومت کو اس کی خبر ہوگئی اور انڈونیشی پولس نے تمام پوسٹ کارڈ ضبط کرلئے (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ فروری ۱۹۷۹) اس قسم کی خبریں دوسرے مسلم ملکوں سے بھی مل رہی ہیں۔ مسلم حکمراں خومینی کے زیر اثر قائم شدہ ایرانی اسلامی حکومت کو اگرچہ سرکاری طور پر مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں مگر خود اپنے ملک میں "خومینی افکار" کی درآمد کو وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بظاہر کامیاب اسلامی تحریک عملاً الٹا اثر پیدا کررہی ہے۔ وہ اسلام کی کامیابی کے نعروں کے جلو میں اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع کو برباد کررہی ہے۔

پاکستان، ایران اور بعض دوسرے ملکوں میں مسلم رہنماؤں نے اپنے سیاسی عزائم کے لئے "اسلامی حکومت" کے لفظ کو ایک کامیاب عوامی نعرہ پایا ہے۔ مگر اسلام کو سیاسی نعرہ بنانا اسلام کو اسلام کے نام پر قتل کرنا ہے۔ موجودہ حالات میں کوئی بھی مسلم ملک اپنے معاشرتی حالات کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ اسلامی حکومت کے قیام کی زمین بن سکے۔ مزید یہ کہ جو لیڈر اس قسم کی تحریک چلا رہے ہیں وہ خود بھی اسلامی قیادت کے اوصاف سے بالکل خالی ہیں۔ ایسی حالت میں اسلامی حکومت کا نعرہ صرف تخریبی کارروائیوں کے لئے ایک کامیاب ہتھیار بن سکتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اس قسم کی تحریکوں کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اسلام کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لئے اسی طرح سیاسی خطرہ کے ہم معنی بنتا جارہا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم کا لفظ امریکی حکمرانوں کے لئے بنا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر کوئی دیرپا کام کرنا دن بدن مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین اگرچہ اسلام کے نعرہ پر اٹھے ہیں مگر وہ جس زمین پر کھڑے ہوئے ہیں وہ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین ہے نہ کہ حقیقۃً اسلام کی طلب کی زمین۔ آزادی اور جمہوریت اور سوشلزم کے علم بردار جس عوامی بے چینی کو استعمال کرکے اپنی سیاسی تحریکیں چلا رہے ہیں، اسی بے چینی کو مسلم قائدین اسلام کے نام پر استعمال کررہے ہیں۔ اس سے زیادہ اس قسم کی تحریکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفروضہ غیر اسلامی حکومت کو اکھاڑنے کے بعد جب مطلوبہ اسلامی حکومت بنانے کا سوال ہوتا ہے تو قائدین اور ان کا ساتھ دینے والی بھیڑ دونوں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں جو مادی سیاسی تحریکیں اٹھیں انھوں نے ہر ملک میں "عوام دشمن" حکومتوں کو اکھاڑ پھینکا مگر وہ حقیقی عوامی حکومت قائم نہ کرسکیں۔ یہی انجام اسلامی تحریکوں کے لئے بھی مقدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی تحریک صالح دینی نظام قائم کرسکتی ہے جو دینی محرکات کے تحت اٹھی ہو۔ سیاسی اور معاشی بے چینی کی زمین سے ابھرنے والی تحریکیں صرف نیا فساد برپا کریں گی، وہ ہرگز کوئی صالح نتیجہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ منفی بنیادوں پر جو اتحاد پیدا ہو وہ ہمیشہ انتشار پر ختم ہوتا ہے اور مخالفانہ قسم کا سیاسی شور وشر بالآخر بدترین بے عملی پر۔ ایران کے واقعات میں جن لوگوں کو اسلام کا سورج ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے، بہت جلد وہ دیکھ لیں گے کہ ان کی یہ رائے سطحی خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ (۲۲ فروری ۱۹۷۹)

موجودہ زمانہ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اپنی حکومت کے استحکام کی یہ آسان تدبیر دریافت کی ہے کہ اسلام کے نام پر کوڑے مارو اور خوفناک سزائیں جاری کرو، تاکہ عوام اور انقلاب پسند عناصر سہم جائیں اور ان کی آمریت کے خلاف اٹھنے کی ہمت نہ کریں۔ قدیم زمانہ میں بادشاہوں کو ایسے علما مل جاتے تھے جو ان کی ہوس ناکی کے منصوبوں کے لئے شرعی سند عطا کرتے رہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے ان حکمرانوں کی خوش قسمتی سے ان کو ایسے افراد اور ادارے مل گئے ہیں جو ان کے تاریک منصوبوں کے حق میں یہ فتوی دے سکیں کہ یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے، صرف اس قیمت میں کہ ان کو کچھ نذرانے اور اعزازی عہدے حاصل ہو جائیں۔

مگر اسلام کوڑے مارنے اور ہولناک سزائیں جاری کرنے کا نام نہیں۔ اس قسم کی حدود اور تعزیرات اسلام کے پورے بامعنی وجود سے بس اتنی ہی نسبت رکھتے ہیں جیسے ایک زندہ انسان کا اپنے بڑھے ہوئے ناخن کو کاٹنا۔ اسلام خدا کی رحمتوں کا دین ہے۔ وہ جنتی فضاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ وہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا موت سے پہلے والی دنیا میں مظاہرہ ہے۔ یہ جنت کے شہریوں کا دنیا میں اتر آنا ہے۔ وہ ملکوتی اوصاف جو کسی بندۂ خدا کو جنت کی ناقابل بیان خوشیوں کا مستحق بناتے ہیں، جب ایسے اوصاف کے لوگ اقتدار کے مناصب پر قبضہ پالیں تو اسی کا دوسرا نام اسلامی نظام ہے۔ اسلامی نظام وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو آسمانوں والے خدا کو زمین پر کھڑا ہوا دیکھتے ہوں۔ جو اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس حد تک گم کر چکے ہوں کہ اپنی ذات کے منصوبے ان کے لئے باقی نہ رہیں۔ اسلامی نظام برپا کرنے والے وہ ہیں جو دوسرے کے درد پر تڑپتے ہوں۔ جو دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہوں۔ جن کا حال یہ ہو کہ ذمہ داریوں کا احساس ان سے زندگی کی خوشیاں چھین لے۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا فکر ان کے لئے اقتدار کی کرسی کو کانٹوں کی کرسی بنا دے۔ جو حکومتی مواقع کے ملنے پر آنسو بہانے والے ہوں نہ کہ قہقہہ بلند کرنے والے۔

زمین کے اوپر جب ایک درخت کھڑا ہوتا ہے اور اپنی سرسبز ٹہنیوں میں پھول اور پھل لگاتا ہے تو یہ ایک پیچیدہ ترین کائناتی منصوبہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام گویا انسانی سماج میں خدا کا شرعی پھول اور پھل اگانا ہے۔ یہ ایک انتہائی لطیف اور انتہائی مشکل منصوبہ ہے۔ جس طرح ایک درخت طویل مدت تک خاموش عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس قابل بنتا ہے کہ وہ اپنے ہریالے تنہ کے اوپر رنگ اور مزہ اور خوشبو کا وہ فرحت بخش مجموعہ ظہور میں لائے جس کو پھول اور پھل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام کا قیام بھی ایک بے حد سنجیدہ اور بے حد طویل منصوبہ ہے۔ یہ نہایت گہری جدوجہد کا طالب ہے۔ کچھ زندگیاں درخت کے بیج کی مانند اپنے آپ کو عظیم مقصد کی خاطر قربان کر دیتی ہیں۔ کچھ روحیں عالم حقائق میں گم ہو کر خدا کے چھپے ہوئے خزانوں کو اجتماعی سطح پر بکھیرتی ہیں تو اس کے بعد وہ واقعہ رونما ہوتا ہے جس کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے کچھ لوگ جو جیتے جی اپنے آپ کو آخرت میں پہنچا چکے ہوں، جب وہ آخرت کی ابدی تجلیوں کو دنیا میں اتارتے ہیں تو اسی انعکاس نور کا نام اسلامی نظام ہوتا ہے۔ اسلامی نظام خدا کی اخروی نعمتوں کا زمینی ظہور ہے۔ جو لوگ اپنی جاہ طلبی کے تماشوں کو اسلامی نظام کا نام دیتے ہیں، ایسے لوگ اسلامی نظام قائم کرنے کا کریڈٹ تو کیا پائیں گے، البتہ یہ اندیشہ ہے کہ خدا کے یہاں وہ دھوکہ بازی کے مجرم قرار دئے جائیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز و شاداب درخت کہنے کی جسارت کی تھی۔ (۴ اپریل ۱۹۷۹)

اسلامی تخریب کاری

ایک خبر پڑھئے: نائجیریا کی احمد و بیلو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں عرصہ سے شراب کی ایک کینٹین قائم تھی۔ یونیورسٹی کے ”اسلام پسند“ طلبہ اس کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انتظامیہ اس کو نہیں مان رہی تھی۔ معاملہ اسی طرح ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکوں نے نوٹس دے دیا کہ شراب خانہ اگر ہال سے ہٹایا نہیں گیا تو وہ اس کو توڑ ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے حکام نے اس کے جواب میں کہا کہ جو لوگ ایسا کریں گے ان کو سخت نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ طلبہ اور انتظامیہ کی یہ کشمکش بالآخر ۵ مئی ۱۹۸۱ کو بھڑک اٹھی۔ طلبہ نے دھاوا بول کر شراب خانہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد انتظامیہ نے اس تخریبی کارروائی میں ملوث ۲۴ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد اور آگ بھڑکی۔ طلبہ نے یونیورسٹی حکام کے ”غیر اخلاقی رویہ“ کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یونیورسٹی کے در و دیوار کو اسلامی نعروں سے بھر دیا۔ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کی دو طالبات نے قومی ترانہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے مطابق قومی ترانہ میں ”خدا پرستی کے بجائے قوم پرستی کا ذکر ہے“ اب حکومت نے مزید ۲۷ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں ہزاروں طلبہ کا تعلیمی نقصان ہوا اور مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ (۷ اگست ۱۹۸۱)

عرب کے لوگ شراب پیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سالوں تک ان کو سمجھاتے رہے اور ان کے دل کو نرم کرتے رہے تاکہ وہ شراب کی برائی کو سمجھ جائیں اور خود اپنے ہاتھ سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالیں۔ آج ان کے ماننے والے ان کے نام پر تخریب کاری کے ذریعہ شراب کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عین اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ”شراب پینے والوں“ کے پاس ایک دن بھی اس جذبہ سے نہیں گئے کہ ان کو دل سوزی اور خیر خواہی کے انداز میں سمجھائیں۔ ان کی ایک رات کی نیند بھی ان کے حق میں دعائیں کرنے میں خراب نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک بار بھی اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ فی الواقع اپنے بھائیوں کی گمراہی پر تڑپ رہے ہیں اور ان کے برے انجام کے غم میں ان کا یہ حال ہو رہا ہے گویا کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ ان کا سارا شوق بس یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ خدا کی نظر میں داعی اور مصلح بننا چاہتے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک دن بھی دعوت اور اصلاح کا عمل نہیں کیا۔

اس قسم کی اسلامی تخریب کاری آج بہت بڑے پیمانہ پر مسلم دنیا میں جاری ہے۔ مگر ان چیزوں کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ سراسر لیڈری ہے۔ کچھ لوگ اِس نام پر لیڈری کے ہنگامے برپا کئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اُس نام پر۔ کچھ لوگ ایک عنوان پر اپنے حریف کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ دوسرے عنوان پر۔ جو لوگ اس تخریبی سیاست میں مصروف ہیں وہ بلاشبہ مجرم ہیں اور جو لوگ اس تخریب کاری کے حق میں اسلامی جواز پیش کر رہے ہیں وہ مجرموں کے لیڈر۔

ان کا مکمل انقلاب جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا

جے پرکاش نارائن (۱۹۷۹–۱۹۰۲) اپنے علم اور صلاحیت کے اعتبار سے ہندستان کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے۔ ان کو عام طور پر مخلص اور سنجیدہ انسان سمجھا جاتا تھا اور ہر طبقہ کے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ پٹنہ میں ان کے مکان کے سونے کے کمرہ میں دیوار پر یہ شعر لگا ہوا تھا:

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے　　باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

وہ اپنے دل میں سماجی اصلاح کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے اور اپنے الفاظ میں سمپورن کرانتی Total Revolution کے علم بردار تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہندوستان کے لوگ ان کا مطلوبہ مکمل انقلاب لانے کے لئے بے قرار ہیں۔ صرف اندرا حکومت راستہ کی رکاوٹ ہے۔ اندرا حکومت ختم ہو جائے تو اس کے بعد مطلوبہ سماجی نظام نہایت آسانی سے قائم ہو جائے گا۔ ان کو اپنے اس اندازہ پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر فوج اور پولس کو بغاوت پر ابھارنے کو بھی جائز سمجھنے لگے۔ اندرا گاندھی کی بعض غلطیوں نے ان کو موقع دیا اور وہ ۱۹۷۷ میں اس حکومت کو ختم کرنے میں شان دار طور پر کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس "کامیابی" کے معنی صرف یہ تھے کہ اقتدار اندرا اور سنجے کے ہاتھ سے نکل کر مرارجی ڈیسائی اور کانتی ڈیسائی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ مطلوبہ سماجی نظام کا قیام پھر بھی خیالی امید ہی بنا رہا۔ اقتدار کی تبدیلی کے بعد اگرچہ ذاتی طور پر جے پرکاش کا مقام اتنا بلند ہوا کہ ان کو "لوک نائک" کا پُرفخر خطاب دیا گیا۔ تاہم اپنی تمام ظاہری کامیابیوں کے باوجود ۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو وہ دنیا سے اس احساس کے ساتھ چلے گئے کہ ان کا مکمل انقلاب اپنی تمام تر دھوم کے باوجود، جزئی انقلاب بھی نہ بن سکا۔ مزید یہ کہ جنتا پارٹی میں بہت جلد پھوٹ پڑ گئی اور صرف ۲۸ ماہ بعد جنتا حکومت ٹوٹ گئی۔ اپنی محبوب جنتا پارٹی کا یہ انجام جب ان کے علم میں آیا تو ان کی زبان سے نکلا: "باغ اجڑ گیا" (ہندستان ٹائمس ۲۰ جولائی ۱۹۷۹) آخر میں وہ اتنے دل شکستہ ہو گئے تھے کہ موت سے ایک دن پہلے اچھوت پٹور دھن ان سے پٹنہ میں ملے اور ان کی خیریت پوچھی تو انھوں نے کہا: "میں کس طرح جی رہا ہوں، بس موت کا انتظار کر رہا ہوں۔" (ٹائمس آف انڈیا ۹ اکتوبر ۱۹۷۹)

جے پرکاش نارائن کا یہ واقعہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ وہ ایک عبرت کا آئینہ ہے جس میں آپ اسی قسم کی بہت سی دوسری تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک مصلح جب "ظالم حکومت" کو ہٹانے کا نعرہ لگاتا ہے تو مشترک دشمنی کا جذبہ بہت سے مختلف الخیال عناصر کو اکھٹا کر دیتا ہے۔ اس طرح مصلح کی جماعت اقلیت میں ہونے کے باوجود متحدہ محاذ میں شامل ہو کر اکثریت حاصل کر لیتی ہے۔ مگر جب ظالم حکومت ہٹ جاتی ہے تو سب کا مفاد الگ الگ ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ اب مصلح کی جماعت اکیلی ہو کر دوبارہ اسی اقلیت کے مقام پر چلی جاتی ہے جہاں وہ متحدہ محاذ بننے سے پہلے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "ظالم" کو ہٹا کر بھی عادل کو اقتدار کی گدی پر بیٹھا نہیں پاتی۔ جے پرکاش نارائن اور ان کی قسم کے دوسرے مصلحین کی شاندار کامیابی کے معاً بعد عبرتناک ناکامی کا سبب یہی ہے۔

سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے تب وہ سوئی بن کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کرسکے۔ اب اگر ایک جلد باز آدمی ہتھوڑے کی پہلی ہی ضرب سے سوئی بنانا چاہے تو مطلوبہ سوئی تو نہ بنے گی البتہ لوہے کا ٹکڑا ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی کوششوں کا ہوا ہے۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت کے پرشور ہنگاموں کے باوجود آج بھی ہمارا قافلہ اسی مقام پر ہے جہاں وہ ایک سو سال پہلے تھا۔ بلکہ شاید کچھ اور پیچھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لیڈر پہلی ہی ضرب میں ایک عمدہ چمک دار "سوئی" تیار کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ "۲۰ مرحلوں" کے صبر آزما دور سے گزرنا نہیں چاہتے۔

انیسویں صدی میں کچھ لوگوں نے دیکھا کہ مغربی قومیں مسلم ملکوں کے اوپر قابض ہو گئی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس لڑ بھڑ کر کسی طرح ان اجنبی قوموں کو نکال دو اور اس کے بعد اسلام کی عظمت کا دور دوبارہ واپس آجائے گا۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد یہ مہم کامیاب ہو گئی، مگر اسلام اور مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں پہلے تھے وہیں اب بھی باقی رہے۔ کیوں کہ جدید دنیا میں بالادستی کا مقام حاصل کرنے کے لئے بہت سی علمی و عملی تیاریوں کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ہمارے پرجوش لیڈروں نے کچھ نہیں کیا تھا۔

غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں لوگوں نے دیکھا کہ برسر اقتدار پارٹی کے زیر انتظام مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ بس یہ پارٹی ہے جس کے ہاتھ میں بر وقت ملک کا اقتدار ہے۔ اگر اس پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو ہماری تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ الیکشن کے موقع پر دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے سیاسی طوفان مچایا اور بالآخر برسر اقتدار پارٹی کو اقتدار سے ہٹا دیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسری پارٹی منتخب ہو کر اقتدار کے منصب پر بیٹھی اس کے تحت بدستور اسلام اور مسلمان ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ کیوں کہ نئی منتخب پارٹی بھی اسی غیر مسلم اکثریت کے افراد سے بنی تھی جس سے پہلی پارٹی بنی تھی۔ پھر وہ پہلی پارٹی سے مختلف کیوں ہوتی۔

یہی سیاسی ڈراما مسلم اکثریت کے ملکوں میں ایک اور شکل میں دہرایا گیا ہے۔ یہاں اسلامی مفکرین اور ملی قائدین نے دیکھا کہ جو مسلم شخصیت یا مسلم جماعت ان کے ملک میں حکومت کر رہی ہے اس کے زیر حکومت بہت سی غیر اسلامی چیزیں رائج ہو رہی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ بس اس شخص کو کسی طرح مار ڈالو یا اس جماعت کو اقتدار سے ہٹا دو تو اس کے بعد ہر طرف نظام اسلام اور نظام مصطفیٰ کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مختلف اندرونی و بیرونی عناصر کے اشتراک سے یہ مہم کامیاب ہو گئی۔ سب سے بڑے "مخالف اسلام" کو ختم کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد جو دوسرا نظام آیا وہ بھی پہلے ہی کی طرح غیر اسلامی نظام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کو چلانے والے افراد ہمیشہ اپنے سماج سے نکل کر آتے ہیں نہ کہ آسمان سے۔ اور جب سماج بگڑا ہوا ہو تو محض کسی فرد یا کسی سیاسی پارٹی کے بدلنے سے نظام نہیں بدل سکتا ——

اس کے نتیجہ میں قوم کے اندر حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت پیدا ہوتی ہے۔ تعمیری مزاج کے بجائے سیاسی مزاج بنتا ہے۔ پُرامن طریقوں کے بجائے تخریبی طریقے پرورش پاتے ہیں، اور جو مقصد ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

انقلابی خوش خیالیاں

شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستانی حکمرانوں سے شکایت تھی۔ انھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک چلائی۔ مگر جب بنگلہ دیش آزاد ہو چکا اور وہ اپنے بنائے ہوئے ملک کے سربراہ اعلیٰ بن گئے تو ۱۵ر اگست ۱۹۷۵ کو خود ان کے ہم وطنوں نے ان کو اور ان کے سارے خاندان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنگلہ دیش میں فوجی انقلابات کا سلسلہ چل پڑا۔ آخر، نومبر ۱۹۷۵ کو کرنل ابو طاہر ایک خونین انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ صدر ضیاء الرحمٰن اگرچہ اس وقت جیل میں تھے مگر یہ انقلاب کرنل طاہر اور ضیاء الرحمٰن کے مشترکہ منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ انقلاب کے بعد ضیاء الرحمٰن تخت اقتدار پر بٹھا دئے گئے۔ انقلاب سے پہلے ضیاء اور طاہر ایک دوسرے کے دوست تھے۔ مگر ضیاء الرحمٰن نے جب اقتدار حاصل کر لیا تو کرنل طاہر کا وجود ان کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ نظر آنے لگا۔ ضیاء الرحمٰن نے کرنل طاہر کو گرفتار کر لیا۔ ان پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا اور بالآخر انھیں گولی مار دی گئی۔ ایک مصنف اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ معنی خیز سوال اٹھاتا ہے:

Was his support to Zia a good revolutionary strategy
or revolutionary romanticism that was bound to misfire.

کرنل طاہر کا ضیاء الرحمٰن کی مدد کرنا ایک اچھی انقلابی تدبیر تھی یا وہ ایک انقلابی تخیل پسندی تھی جس کے لئے یہی مقدر تھا کہ اس کا نشانہ خطا کر جائے (ہندستان ٹائمس ۴ نومبر ۱۹۷۹)

اس سوالیہ جملہ کو مثبت جملہ بنا دیا جائے تو یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم انقلابیوں کے منصوبہ پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اقدامات کئے حتی کہ بعض اوقات پورے پورے ملک کو ہلا ڈالا۔ مگر ان کا انقلاب جب اپنے آخری نتیجہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس انقلاب کا سارا فائدہ دوسروں کے حصہ میں چلا گیا ہے۔ کامیابیوں کے ہجوم میں اس ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ انقلابی تدبیریں نہ تھیں بلکہ انقلابی خوش خیالیاں تھیں۔ اور حقائق کی اس دنیا میں خوش خیالیوں کی کوئی قیمت نہیں، خواہ ان خوش خیالیوں کے مصنف ایسے لوگ ہوں جن کے معتقدین نے ان کو قائد اکبر اور مفکر اعظم کے خطابات دے رکھے ہوں۔

سیاست، سیاست، سیاست

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا۔ اس سے پہلے وہاں زار کی شاہی حکومت قائم تھی۔ انقلاب سے پہلے وہاں جو اشتراکی تحریک چل رہی تھی اس کا ایک لیڈر جوزف اسٹالن تھا جو لینن کے مرنے کے بعد روس کا کمیونسٹ حکمراں بنا۔ اپنی تحریک کی کامیابی سے پہلے جوزف اسٹالن نے اشتراکی کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "انقلاب لانے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول اسلحہ، دوم اسلحہ، سوم اسلحہ، اور آخر میں پھر اسلحہ"۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے اس جملہ کو یوں بدل دیا: اسلام کو سربلند کرنے کے لئے ہم کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول سیاست، دوم سیاست، سوم سیاست، اور آخر میں پھر سیاست۔ مگر سیاسی طریق کار کے پیچھے اگر ضروری طاقت موجود نہ ہو تو وہ صرف سیاست برائے سیاست ہو کر رہ جاتی ہے وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

عبرت کے لئے

اخبارالاہرام (قاہرہ) کے سابق ایڈیٹر محمد ہیکل کی ایک ۲۸۵ صفحات کی کتاب ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں دی روڈ ٹو رمضان کے نام سے چھپی ہے اور اس کا عربی ترجمہ الطریق الی رمضان کے نام سے شائع ہوا ہے مصنف نے اس کتاب میں اکتوبر ۱۹۷۳ کی مصر۔ اسرائیل جنگ اور اس سے چھ سال پہلے کے حالات پر اپنی معلومات پیش کی ہیں۔ پوری کتاب دل چسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں چند واقعات یہاں عبرت کے لئے نقل کئے جاتے ہیں

وہ ایٹم بم خریدنے گئے

(لیبیا کے فوجی انقلاب ستمبر ۱۹۶۹ کے بعد صدر معمر قذافی قاہرہ آئے) ایک موقع پر جب کہ صدر ناصر ان کو بتا رہے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ میں طاقت کی نسبت کیا ہے۔ قذافی نے بھڑک کر کہا: نہیں، نہیں۔ ہمیں سیدھے ایک بھرپور جنگ کرنا چاہئے اور اسرائیل کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ ناصر نے ضبط کرتے ہوئے کہا یہ ناممکن ہے۔ بین اقوامی صورت حال ہم کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ نہ روس اور نہ امریکہ ایسی صورت حال پیدا ہونے کی اجازت دیں گے جس سے ایٹمی جنگ چھڑ سکتی ہو۔ قذافی نے پوچھا: ”کیا اسرائیل کے پاس ایٹم بم ہیں“۔ ناصر نے کہا: ہاں اس کا غالب امکان ہے۔ قذافی نے دوبارہ پوچھا: کیا ہمارے پاس بھی ایٹم بم ہیں۔ ناصر نے کہا: نہیں۔ ہمارے پاس نہیں ہیں۔

دو یا تین ماہ بعد لیبیا کی دوسرے درجہ کی بڑی شخصیت میجر جالود اچانک مصر آئے اور ناصر سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا یہ سفر بہت خفیہ ہے اور ان کا واحد مقصد صدر ناصر سے ملنا ہے۔ صدر ناصر نے ملاقات کے وقت پوچھا کہ ان کو کیا مشورہ درکار ہے۔ جالود نے کہا: ہم ایک ایٹم بم خریدنے جا رہے ہیں۔ ناصر نے پوچھا وہ کہاں سے اس کو خریدنے جا رہے ہیں۔ جالود نے کہا کہ ان کو معلوم ہے کہ امریکی اور روسی ہمارے ہاتھ ایٹم بم بیچنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ مگر امید ہے کہ چینی اس کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ناصر نے کہا کہ جہاں تک وہ جانتے ہیں ایٹم بم خرید کر کبھی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ جالود نے کہا: ہم کوئی بڑا ایٹم بم نہیں چاہتے۔ بس جنگی تدبیر کے طور پر ایک (اوسط درجہ کا) بم کافی ہو گا۔ ہم نے چینیوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ ہم اپنا ایک آدمی وہاں ملاقات اور گفتگو کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم خیر مقدم کے لئے تیار ہیں۔ اب میں چین جا رہا ہوں۔

جالود بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ انھوں نے لیبی پاسپورٹ کے بجائے مصری پاسپورٹ لیا اور پاکستان اور ہندوستان کے راستے سے سفر کر کے پیکنگ پہنچے۔ چینیوں کو خبر نہ تھی کہ اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ مگر چو این لائی کے ساتھ ملاقات کا ایک وقت مقرر ہو گیا۔ اس ملاقات میں لیبیا کی انقلابی کونسل کے نائب صدر نے بتایا کہ وہ ایک بہت ضروری معاملہ کے لئے پیکنگ آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چین تمام ایشیائی ملکوں کے لئے باعث فخر ہے۔

آپ لوگوں نے پس ماندہ ملکوں کی مدد کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگ اتنے ہی طاقت ور ہیں جتنا کہ مغرب۔ اس لئے ہم لیبیا سے آپ کی مدد حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ چیزیں بہت زیادہ داموں میں تیار ہوتی ہیں۔ ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں۔" چاؤ این لائی نے اس کے جواب میں نہایت نرم لہجہ اختیار کیا۔ انھوں نے معیاری چینی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ایٹم بم فروخت نہیں کئے جاتے۔ چین کو یقیناً اس سے خوشی ہوگی کہ وہ ریسرچ کے کام میں لیبیا کی مدد کرے جس طرح چند سال پہلے چین نے مصر کو تحقیقاتی مدد دینے کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی۔ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری لیبیا کو خود اپنے آپ کرنی ہوگی۔ ہر قوم کو خود کفیل بننے کی کوشش کرنا چاہئے۔ وغیرہ۔ چنانچہ میجر جالود چین سے خالی ہاتھ واپس آ گئے (صفحہ ۷۷-۷۶)

کہا جاتا ہے کہ صدر ناصر جب مصر میں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے بھی ایٹم بم کی خریداری کے لئے ایک وفد روس بھیجا تھا اور وہاں ان کو وہی جواب دیا گیا جو لیبی وفد کو چین میں جواب دیا گیا۔

ایک تسبیح کے بدلے ۲۰ ملین پونڈ

لیبیا میں یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کے انقلاب کے نتیجہ میں شاہ ادریس کی حکومت ختم ہو گئی اور موجودہ حکومت قائم ہوئی۔ اس واقعہ کی خبر جب پہلی بار صدر جمال عبد الناصر کو دی گئی تو حاضرین نے اس پر مختلف انداز سے تبصرہ شروع کیا۔ صدر ناصر نے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا: مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر جب کہ ہم کو ہتھیار خریدنے کے لئے رقم کی فوری ضرورت تھی۔ میں نے حسن صبری الخولی کو شاہ ادریس کے پاس بھیجا اور ان سے اس موقع پر تعاون کی درخواست کی۔ شاہ ادریس نے فوراً وعدہ کر لیا کہ وہ ہم کو ۲۰ ملین پونڈ دے دیں گے، صرف ایک شرط پر — وہ یہ کہ ہم ان کو وہ تسبیح واپس کر دیں جو ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے الازہر کی مسجد کے لئے دی تھی اور جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ اب بھی مسجد کی کسی کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے حسن الخولی سے کہا کہ وہ الازہر جائیں اور مذکورہ تسبیح حاصل کریں اور اس کو شاہ ادریس تک پہنچا دیں۔

حسن الخولی نے فوراً ایسا کیا اور شاہ ادریس نے وعدہ کے مطابق ہم کو ۲۰ ملین پونڈ کی رقم پیش کر دی صفحہ ۶۹-۶۸

ہارنے والے کو خوش آمدید!

۱۹۶۷ء کی مصر-اسرائیل جنگ میں مصر کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۶۷ میں خرطوم کانفرنس ہوئی۔ ناصر کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچے تو خرطوم کے ہوائی اڈے پر تقریباً پانچ لاکھ آدمی ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ امریکی میگزین نیوز ویک نے اپنی رپورٹ میں اس کا عنوان قائم کیا: مفتوح کو خوش آمدید (Hail to the Conquered) تاہم اسی اجلاس میں شرکت کے لئے اگلے دن شاہ فیصل مرحوم آئے تو ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کرنے کے لئے کوئی بھیڑ موجود نہ تھی۔ تھوڑے سے لوگ جو آئے انھوں نے بھی جو نعرہ لگایا وہ یہ تھا "ناصر کا ساتھ دو" (صفحہ ۵۲)

یہ خوش خیال مفکرین

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ — ۱۸۷۷) ایک آفاقی شاعر تھے۔ نہ صرف چین و عرب بلکہ سارا جہان ان کا وطن تھا۔ ان کا سبق تھا: زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز (زمانہ اگر تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے لڑکر زمانہ کو اپنے موافق بناؤ) انھوں نے مسلمانوں کو اس قسم کے نغمے دئے:

کافر کی یہ تعریف کہ آفاق مین گم ہے — مومن کی یہ تعریف کہ گم اس میں ہیں آفاق

مگر یہی اقبال تھے جنھوں نے ۱۹۳۱ میں ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ شاعری کی دنیا میں اقبال سارے آفاق کو اپنے اندر گم کئے ہوئے تھے۔ مگر عمل کی دنیا میں وہ پوری زمین تو درکنار ایک ملک کو بھی اپنے اندر گم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ وہ ملک کے کنارے ایک ایسا چھوٹا ٹکڑا حاصل کرنے پر قانع ہو گئے جہاں مسلمان پہلے سے اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب ہوں۔ وہ شخص جو شاعری کی سطح پر "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کا ترانہ گا رہا تھا وہ عمل کی سطح پر ملک کے اکثریتی فرقہ کو بھی اپنے اندر ضم کرنے کا منصوبہ نہ بنا سکا۔ اس سے نجات کی صورت اس کی سمجھ میں صرف یہ آئی کہ بٹوارہ کرکے اپنے لئے علیحدگی کا ایک گوشہ تلاش کرلے ——— یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان مفکرین اور مصلحین کا حال نظر آتا ہے۔ تقریر اور تحریر میں ان کی منزل چرخ نیلی فام سے بھی پرے ہوتی ہے۔ الفاظ کی دنیا میں آسمان کے ستارے بھی ان کی گرد راہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر آتے ہی ان کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ایک پھولا ہوا غبارہ تھا جو واقعات کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گیا۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ — ۱۸۷۸) عالمی اسلامی خلافت کے لئے اٹھے۔ ان کی شاندار اسلامی تقریروں سے ایک پورا براعظم گونج اٹھا۔ شعر کی فضاؤں میں وہ "یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے" کی سطح پر پرواز کر رہے تھے۔ مگر ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۱ میں خلافت کا ادارہ ختم کر دیا تو ان کی قیادت بے زمین ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ان کے لئے کرنے کا کام اس کے سوا کچھ اور نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ایک مشترک وطن کی آزادی پر قربان کر دیں۔ جو شخص عالمی اسلامی خلافت پر جان دینے کے لئے اٹھا تھا اس نے ایک ایسی وطنی آزادی پر جان دینا پسند کر لیا جو عملاً مسلم اقلیت کے اوپر غیر مسلم اکثریت کے غلبہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اسلامی خلافت کا مینار گاندھیائی خلافت کی بنیاد کی ایک اینٹ بن کر رہ گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ — ۱۸۸۸) نے اپنی زندگی کا آغاز الہلال اور البلاغ کی پرشور تحریروں اور مسلم اجتماعات میں اپنی عالی شان تقریروں سے کیا۔ اس وقت وہ قرآن سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ انھوں نے "پیغمبرانہ زبان" میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ خدا کی کتاب لے کر اٹھیں اور خیر الامم کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سارے عالم کے لئے آفتاب و ماہتاب بن جائیں۔ مگر قرآنی انقلاب کا پیغام دینے والا بالآخر ہندستانی قومیت کا پیغام دینے والا بن گیا۔ وہ شخص جس نے "حزب اللہ" کے قیام کو اپنا مقصد بتایا تھا وہ حزب الوطن کی سطح پر آکر ٹھہر گیا۔ ۱۹۴۷ میں ان کی دعوت پر سارے ملک کے مسلمان لکھنؤ کنونشن میں جمع ہو گئے۔ مگر اس نازک تاریخی موڑ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ہندستانی مسلمانوں کے لئے جو پیغام تھا وہ صرف یہ کہ ——— سارے مسلمان انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ - ۱۹۰۳) کی مثال اور بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد حاکمیت خدا پر رکھی۔ انھوں نے کہا کہ زمین پر صرف خدا کے قانون کی حکمرانی قائم ہونی چاہئے۔ اس کے سوا جتنے قانون انسان نے بنائے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ مسلمان کے لئے ایسی زندگی حرام ہے جب کہ وہ غیر خدائی قانون پر راضی ہو جائے۔ اس کو یا تو خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے یا اس کے نفاذ کے لئے لڑتے ہوئے مرجانا ہے: "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون - - - ھم الفاسقون - - - ھم الظالمون (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا تھا کہ غیر خدائی قانون کو بنانے والا قانون ساز، اس کے تحت فیصلہ کرنے والا جج، اس کو نافذ کرنے والی حکومت، سب کے سب فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک شخص مسلّمہ طور پر مجرم ہو اور اس کو انسانی قانون کے تحت سزا دی جائے تب بھی وہ جرم کی سزا نہیں ہوتی بلکہ خود ایک جرم ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی زمین پر کسی کو یہ طے کرنے کا حق نہیں کہ کسی جرم پر کسی کو کیا سزا دی جائے نہ کسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بطور خود کسی سزا کو نافذ کرے۔ گویا کہ وہ شخص جو انسانی قانون کے تحت ایک قاتل کو قتل کرتا ہے وہ خود بھی ایک قاتل ہے۔ کیوں کہ اس نے خدا کی زمین پر خدا کی اجازت کے بغیر خدا کی پیدا کی ہوئی ایک جان کو ہلاک کیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ساری عمر قانون اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے۔ عمر کے آخری حصہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو پاکستان میں فوجی انقلاب آیا اور جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم ہوگئی جس کو نہ صرف مولانا مودودی کی مکمل تائید حاصل تھی بلکہ ان کی اپنی جماعت کے کئی افراد اس میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے۔ اس حکومت کے تحت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چلایا گیا جو خود مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے مطالبہ "پہلے احتساب پھر انتخاب" کے مطابق تھا۔ ان کے لئے پورا موقع تھا کہ وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو شرعی قانون کی عدالت میں کھڑا کریں اور اسلامی احکام کے مطابق ان پر باقاعدہ مقدمہ چلائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ساری دنیا کے سامنے اسلام کی وہ "عملی شہادت" پیش کر دیتے جس کے وہ زندگی بھر مبلغ رہے تھے اور جس کے بغیر ان کے نزدیک دعوت اسلامی کا کام مکمل نہیں ہوتا —— مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی پوری جماعت کی مکمل تائید و حمایت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلایا گیا۔ پاکستان میں اس وقت تین قسم کی عدالتیں ہیں۔ ایک فوجی عدالت، دوسرے شرعی عدالت، تیسرے برطانوی قانون کے تحت قائم شدہ عدالت جو تقسیم کے پہلے سے چلی آرہی ہے۔ وہ مسٹر بھٹو کے مقدمہ کو شرعی عدالت میں جاری کرا سکتے تھے۔ بالفرض اگر شرعی عدالتوں کے اختیارات محدود ہوں تو صدارتی فرمان کے ذریعہ اس کے اختیار کو وسیع بنا کر اور حسب ضرورت قاضیوں کا تقرر کر کے یہ کام عمل میں آسکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ مولانا مودودی یا ان کی جماعت کے کسی شخص نے اس کا مطالبہ تک نہیں کیا۔ مسٹر بھٹو کا مقدمہ، شرعی عدالت کو چھوڑ کر، اس عدالت کے زیر سماعت لایا گیا جو برطانوی قانون پر مبنی چلی آرہی ہے۔ مسٹر بھٹو پر قتل کا الزام تھا جس کے لئے واضح قوانین اسلامی شریعت میں موجود ہیں۔ مگر ان کا مقدمہ جانتے بوجھتے برطانی قانون تعزیرات کے تحت چلایا گیا نہ کہ اسلامی قانون تعزیرات کے تحت۔

پاکستان کا یہ مشہور ترین مقدمہ مولانا مودودی کی مکمل تائید و حمایت کے تحت چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو

مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی جب کہ مولانا مودودی زندہ سلامت موجود تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریہ کے مطابق یہ ساری کارروائی تحاکم الی الطاغوت (اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے اس حاکم کے پاس جانا جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو) کی مصداق تھی۔ وہ مکمل طور پر غیر اسلامی تھی کیوں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت عمل میں لائی گئی۔ مگر مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کی پوری تائید کرتے رہے۔ وہ شخص جس نے اس عنوان سے شہرت پائی کہ وہ اس اصول کا سب سے بڑا مبلغ ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون کے سوا کسی اور قانون پر فیصلہ کرنا کفر اور ظلم اور فسق ہے، یہ طاغوتی عدالت کے پاس اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے جانا ہے جو سراسر ایمان کے منافی ہے۔ جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لئے کسی طرح راضی نہ تھا۔ اس نے خود اپنے اختیار سے اس اصول کو دفن کر دیا۔ اس نے اپنی پوری تائید اور اہتمام کے ساتھ غیر خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ایک مشہور ترین "مجرم" پر مقدمہ چلوایا اور اسی غیر خدائی قانون کے مطابق اس شخص کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ وہ شخص جو ساری عمر خدائی قانون کے نفاذ کی تحریک چلاتا رہا، پہلا موقع ملتے ہی اس نے اپنے عمل سے یہ گواہی دی کہ ملک کے لئے یا کم از کم اس کے اپنے مقصد کے لئے سب سے زیادہ کارآمد قانون وہ ہے جو انسان کا بنایا ہوا ہے —— موجودہ زمانہ میں ہمارے قائدین نے بڑی بڑی اسلامی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر وہ اپنی تحریک کی آپ تردید کرتے رہے۔ پھر جو لوگ اپنی تردید آپ کریں وہ اپنے باہر کس طرح اس کو نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کی ایک انوکھی خصوصیت ہے۔ وہ شان دار کامیابی حاصل کرنے کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہوجاتی ہیں۔ پاکستان میں اسلام پسند مفکرین کا کہنا تھا کہ ملک کے ۹۹ فی صد لوگ اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ صرف بھٹو جیسے چند لوگ ہیں جو اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر ان تھوڑے سے لوگوں کو میدان سے ہٹا دیا جائے اور اس کے بعد عوامی انتخاب ہو تو سارے لوگ اسلام کو ووٹ دیں گے اور اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسری چیز قائم نہ ہوسکے گی۔ بے شمار ناقابل بیان قربانیوں کے بعد "بھٹوؤں" کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی مفکرین کے پسندیدہ حکمراں جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ کو پاکستان میں عام الکشن کرائیں گے۔ پھر اس کو ملتوی کرکے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ کی تاریخ الکشن کے لئے مقرر کی گئی جو دوبارہ منسوخ کر دی گئی۔ دونوں بار جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ چوں کہ "مثبت نتائج" کی امید نہیں اس لئے الکشن ملتوی کئے جاتے ہیں۔ "بھٹوؤں" کے خاتمہ پر پاکستان کے اسلام پسند عام الفتح (۱۹۷۷) منا چکے تھے۔ مگر جب انتخاب کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ عوامی رائے کے ذریعہ ان کے لئے اقتدار پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ابتدائی اندازہ کرنے کے لئے ملک میں بلدیاتی الیکشن (ستمبر ۱۹۷۹) کرایا گیا۔ مگر ہر قسم کی پابندیوں کے باوجود "بھٹو پارٹی" نے ۸۰ فی صد نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد عام انتخابات کا منصوبہ مستقل طور پر ختم کر دیا گیا۔ شاندار فتح حاصل کرنے کے باوجود صرف شان دار ناکامی اسلام پسندوں کے حصہ میں آسکی۔ اب پاکستان میں جو "اسلام پسند" حکومت قائم ہے وہ صرف جبر کے زور پر قائم ہے نہ کہ عوامی تائید کے زور پر۔

اب ایران کی مثال لیجئے۔ شاہ محمد رضا پہلوی نے جب جنوری ۱۹۷۹ میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ملک کو چھوڑا اور فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ روح اللہ خمینی فاتحانہ انداز سے تہران کے ہوائی اڈہ پر اترے تو اسلام پسندوں نے اس کو ایسا انقلاب قرار دیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مگر بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے باوجود ایران کو نئے انقلاب نے

جو کچھ دیا وہ صرف وحشت و بربریت تھی۔ ایران کے عوام کو اسلام کی برکتوں کا کوئی تجربہ نہ ہو سکا۔ اٹلی کی ایک صحافی خاتون اور یانا فلاسی (Oriana Fallaci) نے اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا دورہ کیا اور ایران کے مطلق حکمراں آیات اللہ روح اللہ خمینی کا انٹرویو لیا۔ خاتون نے موصوف سے پوچھا "میں نے ایران کے دورہ میں دیکھا کہ یہاں اسلامی انقلاب کے نتائج سے لوگ بہت غیر مطمئن ہیں۔ ہر طرف انتشار اور بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے اسلامی انقلاب کا وہ پھل لوگوں کو نہیں ملا جس کا ان سے انقلاب سے پہلے وعدہ کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ یہاں کچھ لوگ ہیں جو اندیشہ کر رہے ہیں کہ ایران کے لئے بہت مشکل ایام آنے والے ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے" آیات اللہ خمینی جن کی عمر ۸۰ سال ہو چکی تھی، اس کے جواب میں کہا: ہم اس بچہ کی طرح ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ ماہ ہے۔ ہمارے اسلامی انقلاب کی عمر صرف چھ مہینے ہے۔ ہم اپنے سفر کے آغاز میں ہیں۔ آپ ایسے بچے سے کیا امید کر سکتی ہیں جس کی عمر ابھی صرف چھ مہینے ہو (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ نومبر ۱۹۷۹)

ایران کے اسلامی لیڈر کا یہ جواب صرف اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا انقلاب شاندار کامیابی کے باوجود صرف شاندار ناکامی تک پہنچا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک "بچہ" ہوتی ہے، انقلاب کبھی "بچہ" نہیں ہوتا۔ انقلاب تو کسی تحریک کے مکمل عمر کو پہنچنے کا نام ہے۔ پھر وہ بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ انقلاب جو انقلاب کے مرحلہ میں پہنچ کر بچہ ہو وہ انقلاب ہی نہیں۔ وہ صرف ایک ہڑبونگ ہے جس کو غلطی سے انقلاب کا نام دے دیا گیا ہے ــــــــ یہی وجہ ہے کہ الٰہی خلافت کے نام پر اٹھنے والے جب اقتدار پاتے ہیں تو فوراً انسانی آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ملک کے مایوس اور ناراض عوام کے درمیان اپنی زندگی کی کوئی صورت انھیں آمریت کے سوا نظر نہیں آتی۔ "اسلامی نظام" قائم کرنے کے دعوے دار بالآخر "غیر اسلامی نظام" قائم کر کے اس کے سایہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے انتہائی بڑے بڑے اسلامی مفکرین و مصلحین کا یہ عبرت ناک انجام کیوں ہوا۔ اس کے اسباب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ایک مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مفکرین دراصل رومانی مفکرین تھے نہ کہ حقیقت پسند مفکرین، اور رومانی دنیا میں جو خیالی محل بنایا گیا ہو وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی واقعی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ رومانویت (Romanticism) جو اٹھارویں صدی سے لے کر جنگ عظیم اول تک ایک خاص صورت میں یورپ میں پائی جاتی تھی، وہی انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلم مفکرین پر اپنے حالات کے لحاظ سے چھائی رہی ہے۔ ہر قوم جس کا ایک شان دار ماضی ہو اور پھر وہ زوال کا شکار ہو جائے، اس کے بعد جب اس کے درمیان احیاء نو کی تحریک اٹھتی ہے تو اس میں خوش خیال مفکرین کثرت سے جنم لیتے ہیں۔ وہ اپنے تصوراتی ماضی کے زیر اثر اپنے مستقبل کے بارے میں حسین خواب دیکھتے ہیں جو ہمیشہ مبالغہ آمیز حد تک خیالی ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں کوئی واقعہ پیدا کرنے کے لئے لمبا وقت اور خشک عمل درکار ہوتا ہے۔ جب کہ خیالی دنیا میں شان دار قلعہ کھڑا کرنے کے لئے الفاظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لئے ماضی اور مستقبل کے درمیانی فاصلہ کو طے کرنے کے لئے الفاظ کے بڑے بڑے پل بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے دور میں حقیقت پسندانہ بات کرنے والے کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ البتہ آنے والے مستقبل کا جو شخص جتنا زیادہ مبالغہ آمیز نقشہ دکھائے اتنا ہی زیادہ وہ عوام میں مقبول ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام مفکرین خوش خیالیوں کا محل کھڑا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور جس کا

فرضی محل جتنا زیادہ شان دار ہو اتنا ہی زیادہ بھیڑ اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی بھیڑ تخریبی نوعیت کا کوئی "انقلاب" برپا کرنے میں ممکن ہے کامیاب ہو جائے۔ مگر وہ تعمیری نوعیت کا انقلاب لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تخریبی انقلاب کے لئے تو کسی "بھٹو" یا کسی "شاہ رضا" کا گلا گھونٹ دینا کافی ہے۔ مگر تعمیری انقلاب کے لئے "مارنا" نہیں بلکہ "زندہ کرنا" پڑتا ہے۔ اس کے لئے ہوش درکار ہے نہ کہ جوش۔ اس کے لئے حقیقت پسندی درکار ہے نہ کہ خوش خیالی۔ تعمیری انقلاب کے لئے لمبی خاموش جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے مثبت عوامل درکار ہوتے ہیں۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے مطابق حقائق و واقعات کی زمین فراہم کی جائے۔ مگر یہ وہ چیزیں ہیں جو خوش خیال مفکرین کے یہاں سرے سے موجود نہیں ہوتیں۔ ان کا سرمایہ ہوتا ہے — غلو، لفاظی، خیال آرائی، شاعرانہ بلند پروازی۔ اور ظاہر ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کا خیالی محل اپنے لئے حقیقی زمین نہ پاکر اچانک منہدم ہو جاتا ہے۔

اوپر کی گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ زمانہ کے ان اسلامی مفکرین و مصلحین نے کوئی مفید کام نہیں کیا۔ ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ مفید پہلو ہوتے ہیں اور ان کی تحریکوں کے دوران بھی بلاشبہ کئی مفید کام انجام پائے۔ مگر یہ تحریکیں مجموعی طور پر **اثمہما اکبر من نفعہما** (ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے) کا مصداق تھیں۔ اور سب سے بڑا نقصان جو ان تحریکوں کے ذریعہ امت مسلمہ کو پہنچا وہ ذہنی بگاڑ تھا۔ یہ براہ راست طور پر انھیں تحریکوں کا نتیجہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ جذباتی اور غیر حقیقت پسند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئی تحریک جو انسانی معاشرہ میں اٹھے، ضروری نہیں کہ وہ اپنے مقررہ عملی نشانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ تاہم عملی نتیجہ نہ پیدا کر کے بھی وہ ایک نتیجہ لازماً پیدا کرتی ہے، اور وہ فکری نتیجہ ہے۔ ہر تحریک کم از کم اپنے متاثر ہونے والوں میں، سوچنے کا ایک ڈھنگ، رائے قائم کرنے کا ایک طریقہ، معاملات کے بارے میں فیصلہ کا ایک ذہن دیتی ہے۔ اس لئے کسی تحریک کی قدر و قیمت کو اس اعتبار سے متعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عملی طور پر اپنی مقررہ منزل تک پہنچی یا نہیں۔ بلکہ کسی تحریک کی قدر و قیمت کو جانچنے کا اصلی معیار یہ ہے کہ اس نے جن افراد کو متاثر کیا ان کے اندر اس نے کس قسم کا فکری مزاج پیدا کیا۔ اس اعتبار سے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کی قوم کے مزاج کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین و مصلحین کا ایک طبقہ وہ ہے جس کا تمام تر سرمایہ بڑے بڑے الفاظ تھے۔ اس نے شاعرانہ ترنگوں، جوشیلی تقریروں اور خطیبانہ تحریروں کے ذریعہ اپنی تحریکیں چلائیں۔ الفاظ کے زور پر واقعات برآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان تحریکوں نے قوم کے افراد کو صرف جذباتی بنانے میں مدد دی۔ لوگ الفاظ کو واقعہ کا بدل سمجھنے لگے۔ حقیقت پسندانہ طرز فکر ان سے رخصت ہو گیا۔ خیال آرائیوں سے وہ اُس نتیجہ کی امید کرنے لگے جو اس دنیا میں صرف حقیقی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ مفکرین تھے جو خود بھی غلو کا شکار ہوئے اور اپنے افکار سے دوسرے بہت سے لوگوں کو غلو کا شکار کیا۔ وہ سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ ملت کا مستقبل برآمد کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی غلو پسندی صرف سیاسی عمل پر قانع نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے سیاسی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے پورا سیاسی فلسفہ بنایا، حتیٰ کہ خود قرآن و اسلام کو سیاسی بنا ڈالا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے ان کے لئے خدا کا دین ایک قسم کا سیاسی نظریہ بن کر رہ گیا۔ وہ بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ انھوں نے مکمل اسلام کو پا لیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جس اسلام کو پایا اس میں سب کچھ تھا مگر وہی چیز نہ تھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے ——— تعلق باللہ اور خوف آخرت۔

مدعو میں برتری کی نفسیات پیدا کرنا

مسز اندرا گاندھی کو ہندستان کے الکشن ۱۹۷۷ میں مکمل شکست ہوئی تھی، اس کے بعد جنتا حکومت نے پوری کوشش کی کہ ان کو سیاسی منظر سے ہٹا دے۔ مگر جنوری ۱۹۸۰ کے الکشن میں دوبارہ اندرا گاندھی کو اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی کہ ہندستانی پارلیمنٹ کی دو تہائی نشستوں پر ان کی پارٹی قابض ہو گئی۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندستان ٹائمس (۸ جنوری ۱۹۸۰) لکھتا ہے: ملک اپنی جمہوریت پر فخر کر سکتا ہے جس نے اندرا کے لئے اس حیران کن واپسی کو ممکن بنایا۔ ہندستان کا سیاسی ڈھانچہ انتخابی طریقہ کے ذریعہ پر امن سیاسی تبدیلی کے نظام کے ساتھ، ان بہت سے زیر ترقی ممالک سے ممتاز طور پر نمایاں ہے جہاں اختلاف رائے کو سختی سے دبا دیا گیا ہے، انفرادی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور سیاسی تبدیلی صرف تشدد ہی کے ذریعہ وجود میں آسکتی ہے:

> The country can be proud of its democracy which has enabled her to make her stunning comeback. India's political system with its mechanism of smooth political change through the ballot, stands out in striking contrast to those of most developing countries where dissent is stiffled, individual liberties smothered and change ushered in only amid violence.

اس عبارت میں واضح طور پر ایران اور پاکستان جیسے ملکوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اقتباس موجودہ زمانہ کے ایک بہت بڑے المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں انھوں نے اسلام کی کوئی واقعی خدمت تو نہ کی۔ البتہ اسلام کو ایک بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ انھوں نے اپنے "بوائق" کو اسلام کا عنوان دے کر دوسری قوموں کے سامنے اسلام کی تصویر ہلکی کر دی۔ اور اس طرح مدعو اقوام میں غیر ضروری طور پر اسلام کے مقابلہ میں احساس برتری کا جذبہ پیدا کر دیا۔

یہ تحریکیں اگر اسلام کے سوا کسی اور نام پر اٹھتیں تو ان کی نادانیوں کا الزام ان کے اپنے سر جاتا۔ مگر اسلام کے نام پر اٹھنے کی وجہ سے ان کی ہر چیز اسلام کی طرف منسوب ہو گئی۔ وہ قومیں جو اسلام کے لئے مدعو کا درجہ رکھتی تھیں وہ اپنے کو افضل پا کر اس نفسیات میں مبتلا ہو گئیں کہ ان کے پاس وہ چیز زیادہ بہتر طور پر موجود ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ "اسلامی نظام" اور "نظام مصطفیٰ" میں انسان کی آزادی کو کچلا جاتا ہے جب کہ ہمارے اپنے نظام میں انسان کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے۔ ان کے یہاں حرث ونسل کی ہلاکت کی قیمت پر حکومتیں بدلتی ہیں، ہمارے یہاں پر امن انتخابات سے۔ ان کے یہاں سیاسی اختلاف پر کوڑے لگتے ہیں اور ہتھکڑیاں پہنائی جاتی ہیں، ہمارے یہاں سیاسی اختلاف پر کوئی پابندی نہیں۔ ان کے یہاں کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے نہ گواہی شہادت کی ضرورت ہے اور نہ قانون کے تقاضے پورے کرنے کی۔ جس کو چاہا پکڑا اور سرسری سماعت کے بعد گولی مار دی یا جیل میں بند کر دیا۔ ہمارے یہاں کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک اس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر قانونی طور پر اس کو مجرم ثابت نہ کر دیا جائے۔ ان کے یہاں اختلاف کو آپس کی مار کاٹ کے ذریعہ طے کیا جاتا ہے، ہمارے یہاں آپس کا اختلاف پر امن ذرائع سے طے ہو جاتا ہے ——— مسلمان اپنی نالائقی کی بنا پر موجودہ دنیا میں دوسرے درجہ کی قوم بن چکے تھے، اب انھوں نے اسلام کی غلط نمائندگی کر کے اسلام کو بھی قوموں کی نظر میں دوسرے درجہ کا مذہب بنا دیا ہے۔

ضمیر —— دنیا میں خدا کی عدالت ہے

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۷۹ - ۱۹۲۸) کو قتل کے الزام میں راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم واجب القتل تھے یا نہیں، اس میں دنیا کے علما قانون کی دو رائیں ہیں۔ تاہم اس میں دو رائے نہیں کہ پاکستان کے علم برداران اسلام نے ۴ اپریل کی رات کو اس شخص کو قتل کر دیا جس کا نام "ذوالفقار علی بھٹو" تھا۔

اس سلسلے میں ہم پاکستان کے علم برداران اسلام سے صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اصل مسئلہ دنیا کا نہیں بلکہ آخرت کا ہے۔ اگر فی الواقع آپ کے اس اقدام کا مقصد انصاف کے تقاضے پورا کرنا تھا تو اللہ کے یہاں آپ کے لئے اجر ہے۔ اور اگر یہ ایک قانونی ڈراما تھا جو سیاسی مقصد کے لئے کھیلا گیا تو آپ کو ڈرنا چاہئے کہ کل قائم ہونے والی بڑی عدالت میں آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔

ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ آپ اپنا احتساب کرکے دیکھیں کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ تنہائی کے وقت میں جب کہ نہ کوئی آپ کے آگے ہو اور نہ پیچھے، نہ کوئی دائیں ہو اور نہ کوئی بائیں۔ بس آپ ہوں اور آپ کا خدا ہو۔ ایسے عالم میں آپ اپنے کو بے پردہ کرکے دیکھیں کہ اس پھانسی کا محرک آپ کے لئے کیا تھا۔ کیا یہ کہ ایک بے گناہ انسان کے قاتل کو اس کے قتل کی سزا مل جائے۔ یا اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ کام کر رہا تھا کہ ایک سیاسی حریف جس کے متعلق آپ جان چکے تھے کہ الکشن کے میدان میں آپ اس کو شکست نہیں دے سکتے، اس کو قتل کرکے ہمیشہ کے لئے سیاست کے میدان سے ہٹا دیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے ایک عدالتی ڈرامہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

تنہائی کا احتساب جس میں آپ کا دل لرز رہا ہو اور آخرت کے خوف سے آپ کی پلکیں بھیگ گئی ہوں، اگر آپ کو یہ بتائے کہ آپ نے صرف ایک "قاتل" کو اس کے قتل کے جرم کی سزا دینے کے لئے ایسا کیا ہے، اس میں کوئی سیاسی جذبہ شامل نہیں ہے تو بلاشبہ آپ اللہ کے نزدیک بری الذمہ ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ اپنا احتساب کرتے وقت آپ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں۔ آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ کی اندرونی آواز آپ کی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے گواہ کی گواہی آپ کے خلاف ہے۔ آپ سے اتنا بڑا جرم ہو گیا ہے کہ آخرت میں ہمالیہ پہاڑ کے برابر سونا دے کر بھی آپ اپنے کو بری الذمہ نہ کرا سکیں۔ اس دن نہ کسی "جنرل" کو اس کی مسلح فوج بچانے والی ثابت ہوگی اور نہ کسی "اسلام پسند" کو کوئی فوجی حکمراں۔ آج کے تمام بامعنی الفاظ اس وقت بے معنی ہو جائیں گے۔ آج کے تمام ساتھی اس دن ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو آج آپ کو مبارک باد کے تار بھیج رہے ہیں۔

باہر کے جن لوگوں نے اس کارروائی کی تائید کی، ان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔ اگر وہ پائیں کہ ان کی تائید صرف اس لئے تھی کہ قاتل کو اس کے قتل کی سزا ملے تو اللہ کے یہاں ان کے لئے اجر ہے۔ اور اگر اس کے پیچھے دوسرے محرکات کام کر رہے ہوں تو وہ بھی یکساں طور پر اس ذمہ داری میں شریک ہیں۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے: اذا عملت الخطیئۃ فی الارض ـ ـ ـ من غاب عنہا فرضیہا کان کمن شہدہا (ابو داؤد) ■

ہم کہاں ہیں

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ کو ایک بڑی اسلامی شخصیت کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس شخصیت سے وابستہ اخبارات و رسائل میں مرحوم کے بارے میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین نے بتایا کہ مرحوم کے معتقدین مرحوم کے بارے میں کیسی غیر معمولی شیفتگی اور وارفتگی اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے۔ مرحوم کی موت نے ان کے دل کے پیمانہ کو چھلکا دیا اور انھوں نے مرحوم کے تذکرے انتہائی والہانہ انداز میں بیان کئے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میں نے مرحوم کے ایک معتقد سے پوچھا کہ آپ کے یہ اخبارات و رسائل چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے نکل رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان پرچوں میں کبھی خدا کا تذکرہ بھی اس جوش اور وارفتگی کے ساتھ شائع ہوا ہو۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کے کارناموں سے سرشار ہو اور خدا کے نام سے اس کے قلب و روح میں حرکت پیدا ہو جائے۔ پھر کیا آپ کے اخبارات و رسائل کے صفحات میں کبھی خدا کے لئے ان غیر معمولی کیفیات کا مظاہرہ ہوا ہے جو آپ نے اپنے رہنما کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔

یہ صرف کسی ایک اسلامی تحریک کا معاملہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں اور تحریکوں کا حال یہی ہے۔ ان کی مجلسیں اپنے "اکابر" کے تذکرے سے معمور ہیں۔ ہر ایک نے اپنے کچھ بڑے بنا لئے ہیں اور جب ان بڑوں کا نام آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زبان و قلم پہ وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس کسی بھی حلقہ میں یہ نظر نہیں آتا کہ وہاں خدا کے چرچے میں لوگوں کو لطف ملتا ہو، خدا کا نام آنے پر لوگوں کے اندر والہانہ کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ خدا کی حیثیت بس ایک خشک عقیدہ کی ہے۔ جب کہ ان کی اپنی محبوب شخصیتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا نام آتے ہی ان کی پوری ہستی جھوم جاتی ہے۔ ان کے دل و دماغ کا چمن کھل اٹھتا ہے۔ ان کے تصور سے ان کی یادوں کی دنیا میں بہار آجاتی ہے

خدا اپنے سورج کے ذریعہ سارے عالم کو روشن کر رہا ہے مگر اس کو دیکھ کر کسی پر غیر معمولی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ البتہ دنیا کو یہ بتانے میں وہ فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی محبوب شخصیت نے سارے عالم کو اپنی تقریروں سے جگمگا دیا ہے۔ ہواؤں کا نظام دیکھ کر انھیں خدا کی کاریگری پر وجد نہیں آتا۔ البتہ اپنے بزرگوں کے کارنامے بتانے کے لئے وہ یہ شان دار الفاظ پا رہے ہیں کہ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے فیض کی ہوائیں چلا دی ہیں۔ زمین و آسمان میں خدا کی بے پایاں حکمتیں ان کی روح پر رقص طاری نہیں کرتیں۔ البتہ اپنے محبوب قائد کے فکر و تدبیر کی عظمت کو بتانے کے لئے لغت کے سارے الفاظ بھی ان کو ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنی بے پناہ طاقت سے زمین و آسمان کو سنبھال رکھا ہے مگر اس کو دیکھ کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے۔ البتہ اپنے بڑے ان کو اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے وہ تمام ملکوں اور قوموں کو تھامے ہوئے ہیں۔ پانی کا عجیب و غریب انتظام جس نے زمین کو ساری معلوم کائنات میں ایک استثنائی کرہ بنا دیا ہے ان کو حیرانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے پیشواؤں کے کارنامے بیان کرنے کے لئے وہ پورے جوش سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کے فیض کے چشمے سے ساری دنیا سیراب ہو رہی ہے ـــــ شاید انسان کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا مرکز محبت بنانا چاہتا ہے اور جب خالق اس کو دکھائی نہیں دیتا تو وہ کسی مخلوق کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے۔

نظام مصطفیٰ کی نئی تعبیر

ذوالفقار علی بھٹو کی قید کے زمانہ میں پاکستان قومی اتحاد کے ایک حامی اخبار نے طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

"۔۔۔ اب تو بھٹو نے جیل میں سجادہ بچھالیا ہے، نمازیں پڑھنا شروع کر دی ہیں اور تسبیح ہاتھ میں لئے اوراد و وظائف میں مشغول دکھائی دیتے ہیں (المنبر فیصل آباد ۲۳ مئی ۱۹۷۸) ۴ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مسٹر بھٹو کو جب پھانسی کے تختہ پر کھڑا کیا گیا تو آخری کلمات جو ان کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے: "خدایا میری مدد کر، میں بے قصور ہوں" رپورٹر مسٹر مارک ٹولی (Mark Tully) کے لئے دنیا کو اس واقعہ کی خبر دینا اتنا مہنگا ثابت ہوا کہ نظام مصطفیٰ کے علم بردار نوجوانوں نے اسلام آباد میں رپورٹر کو گھیر کر اسٹک سے مارا اور حکومت نے اس کے خلاف راولپنڈی کے مجسٹریٹ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا ـــــــ نظام مصطفیٰ کی یہ قسم بالکل نئی ہے کہ اس کے علم بردار کسی شخص کو صرف اس کے جرم کی سزا دینا کافی نہیں سمجھتے، اسی کے ساتھ وہ اس کو جہنم میں پہنچانا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہم کو عیسائی ہوجانا چاہئے

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد ۵ اپریل ۱۹۷۹ کو راولپنڈی میں تعزیتی جلسہ ہو رہا تھا۔ عورتیں اور مرد جمع تھے۔ غیر ملکی نامہ نگار بھی جائزہ لینے کے لئے آگئے۔ اس موقع پر ایک پاکستانی مسلم خاتون نے ایک مغربی نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے کہا:

If this is Islam, we should all become Christians

اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب کو عیسائی ہوجانا چاہئے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۶ اپریل ۱۹۷۹) خاتون کے جملہ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام اگر اس کا نام ہے کہ اپنے سیاسی حریفوں کو اخلاقی مجرم بنا کر قتل کرو تو ایسے اسلام سے مسیحیت بہتر ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کی گواہی موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفیٰ" کے علم بردار دے رہے ہیں۔

ایک اقدام سے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں

مسٹر اندر ملہوترا نے ایک مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی کے کیا کیا اثرات کشمیر کی سیاست پر پڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں کشمیری مسلمانوں کی ناراضی اور "ضیاء الحق مردہ باد" کے نعروں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

---Despite the law and order problem that has been created in the valley, the present situation provides this country with an opportunity to eliminate once and for all, the 'Pakistan Factor' from the politica of Kashmir.

The Times of India, April 12, 1979

پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف کشمیر میں جو مظاہرے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے اگرچہ وادی میں امن و نظم کے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ مگر یہ صورت حال ہندستان کے لئے موقع دے رہی ہے کہ وہ کشمیر کی سیاست سے "پاکستانی عامل" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے ـــــــ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام بے شمار پہلوؤں سے اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ تاہم جو لوگ خود غرضی اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ ان پہلوؤں کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔ ■

الفاظ ، الفاظ ، الفاظ

” سیکولر اور جمہوری قوتوں کو منظم کیجئے “
” خیر پسند اور شر بیزار انسانوں کو پکارئے “
” ووٹوں کی طاقت کو دباؤ کی سیاست کے لئے استعمال کیجئے “
” جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ اپنی آواز بلند کیجئے “
” اپنے حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبات کی دھوم مچائیے “
” ظالمانہ حکومت کو متحدہ طاقت سے اکھاڑ پھینکئے “
” جمعہ کے روز مسجدوں اور مدرسوں میں یوم دعا منائیے “
” لوگوں کے دلوں کے دروازہ پر دستک دیجئے “

ہر روز کاغذ کے لاکھوں ورق اس قسم کے الفاظ سے سیاہ ہو رہے ہیں۔ اور بے شمار لاؤڈ اسپیکر ہر دن ان کو فضا میں بکھیر رہے ہیں۔ مگر ان کوششوں سے اتنا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا جتنا قوم کی جیب سے ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الفاظ کی پہلوانی ہے اور الفاظ کی پہلوانی کسی قوم کو حقیقت کی دنیا کا سورما نہیں بنا سکتی۔

فرض نماز کا وقت ہو جائے اور مسجد سے آواز بلند ہو: حیّ علی الصلوٰۃ (آؤ نماز کی طرف) تو اس وقت عبادت الٰہی کا مقام مسجد ہوتا ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مسجد میں آکر اپنے عابد ہونے کا ثبوت دے۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص ایسا کرے کہ عین اس وقت مسجد کے باہر میدان میں شامیانہ لگائے اور لاؤڈ اسپیکر پر ”فلسفہ عبادت“ کے موضوع پر لمبی تقریر شروع کر دے تو یہ اس کے عابد ہونے کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ صرف ظالم ہونے کا ثبوت ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت کسی کے لئے اپنے عابد ہونے کا ثبوت دینے کا مقام مسجد ہے نہ کہ جلسہ گاہ میں عبادت کے عنوان پر شاندار تقریر۔

اس قسم کی غیر مطلوب عبادت آج لوگوں کے اندر بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ دور کے ”مظلومین“ کے بارے میں تجویزیں اور بیانات چھپ رہے ہیں۔ حالاں کہ مظلوموں سے ہمدردی کا ثبوت دینے کا مقام سب سے پہلے آدمی کا اپنا پڑوس ہے۔ دوسروں کو انسانیت اور اخلاق کا سبق دینے کے لئے کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ حالاں کہ انسانیت دوست اور با اخلاق حقیقۃً وہ ہے جو خود اپنے معاملات میں انسانی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کرے۔ ملت کو بچاؤ کا نعرہ ہر ایک لگا رہا ہے مگر فرد کو بچانے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ آدمی اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت وہاں دینا چاہتا ہے جہاں اس کی خدا پرستی ایک شان دار چیز بن کر لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرے، حالاں کہ اس کا خدا جہاں اس کی خدا پرستی کا امتحان لینے کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ مقامات وہ ہیں جہاں سب کچھ کر کے بھی آدمی کو کوئی عزت اور شہرت حاصل نہیں ہوتی۔

مسلمان: کل اور آج

آج کل کسی بڑے قومی ادارہ کا ذکر ہو تو مشکل ہی سے اس کے ذیل میں کسی مسلمان کا نام آتا ہے۔ مگر آزادی سے قبل صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت قومی اداروں کے ساتھ مسلمانوں کے نام اتنی کثرت سے وابستہ تھے کہ کسی ادارہ کے تذکرہ کے ذیل میں کچھ نہ کچھ مسلمانوں کا تذکرہ آجانا ضروری تھا۔ مسٹر ڈی۔ ڈی لکھن پال (سابق صدر ریڈیو مینوفیکچررس ایسوسی ایشن آف انڈیا) پچھلے دور میں لمبی مدت تک آل انڈیا ریڈیو سے متعلق رہے ہیں۔ انھوں نے قومی نشریاتی ادارہ سے متعلق اپنی یادداشت شائع کی ہے (ٹائمس آف انڈیا ۳ جولائی ۱۹۷۵) اس مضمون میں آل انڈیا ریڈیو کے سابقہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کی تعداد کل آٹھ ہے جن میں سے چار مسلمان ہیں:

سر ابراہیم رحمت اللہ، وائی اے فضل بھائی، حاجی حسن علی، سر اکبر حیدری

اسی طرح سوتنتر لیڈر مسٹر مینو مسانی (ـ ۱۹۰۵) سے ایک اخبار نویس نے پوچھا "آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ہیں"۔ انھوں نے جواب دیا: یوسف مہر علی نے میری زندگی کو نئے افکار سے دوچار کیا، میرا کردار بدلا اور میری قوت فکر کو جلا دی۔ وہ میرے کالج کے ساتھی تھے اور میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ انھیں سے متاثر ہوا ہوں (شبستان)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ بوڑھے غیر مسلموں میں کتنے ہی ایسے ملیں گے جو اپنی زندگی کی سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت کی حیثیت سے کسی مسلمان کا نام لیں گے۔ مگر اب یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ اب اس ملک کے مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں قائدانہ مقام سے ہٹ کر پیچھے کی صفوں میں جا چکے ہیں۔

اس فرق کی وجہ کوئی ظلم یا تعصب نہیں ہے۔ اس کی وجہ تمام تر اقتصادی ہے۔ قدیم ہندوستان کی اقتصادی بنیاد زراعت پر قائم تھی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں بڑی بڑی زمینداریاں تھیں۔ یہ صورتِ حال ان کو نہ صرف حوصلہ اور اعتماد دیتی تھی بلکہ وہ مالی قیمت بھی ادا کرتی تھی جو کسی شعبہ میں آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے۔ قدیم زمین دار خاندانوں ہی سے عام طور پر وہ لوگ نکلتے تھے جو علم وعمل کے مختلف شعبوں میں ترقی کرتے تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادیات کی بنیاد زمین کے بجائے صنعت وتجارت ہو گئی۔ مسلمان نئے اقتصادی نظام میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اس لئے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں بھی پیچھے رہ گئے۔

گزرے ہوئے "کل" کو واپس لانے کے لئے احتجاج اور مطالبات کی مہم چلانا اپنی محرومی کی مدت کو مزید لمبا کرنا ہے۔ ہمارے لئے کرنے کا واحد کام یہ ہے کہ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اقتصادیات کی زمین کو دوبارہ حاصل کریں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں ہم کو اپنا کھویا ہوا مقام حاصل ہو سکے۔

ترکی کی یہ تاریخ ایک انتہائی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کس طرح حالات کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے اور نتیجۃً وقت کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں دو اور علامتی مثالیں بھی ہیں۔ ملی کام کے لئے جان دار کارکنوں کا نہ ملنا، اور تیاری کے بغیر اقدامات۔

جدید ترکی میں دو شخصیتیں علمی و فکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۴۰ـ ۱۸۸۸) دوسرے ضیا، گوک الپ (۱۹۲۴ـ ۱۸۷۵) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور ”ترک اتحاد“ کے بجائے ”اسلامی اتحاد“ کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ”نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی“

Halde Edib, Turkey Faces West, P.84

دوسری طرف ضیا، گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست و قیادت پر چھا گئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۹۲۴ـ ۱۸۸۱) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ نامق کمال نے اگرچہ اپنی قوم کے ایک طبقہ میں محبوبیت حاصل کی۔ تاہم اپنے خطیبانہ ادب میں وہ جن خیالات کو پیش کر رہے تھے، ان کے اندر روایتی لوگوں کے لئے خواہ کتنی ہی اپیل ہو، جدید افکار کے عالمی سیلاب میں اس کی حیثیت ایک قسم کے رومانی خواب کی تھی۔ اصولی طور پر بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ اسلام کو اجتماعی اداروں کی بنیاد ہونا چاہیے۔ مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں عملی طور پر سیکولر افکار کا غلبہ ہو، کوئی شخص اپنا علیحدہ جزیرہ تعمیر نہیں کرسکتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عمومی فکری فضا کو اس کے موافق بنا لیا جائے۔

سیاسی حرص کے بجائے سیاسی قناعت

کوئی مرد عورت اپنی اولاد کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہی سیاست کا معاملہ بھی ہے کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پیدا کردہ سیاسی حالات کے منطقی نتائج سے انکار کر سکے۔ ایسی ہر کوشش ہمیشہ الٹی پڑتی ہے اور صرف محرومیوں میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کو پاکستان کی مثال سے سمجھئے۔

پاکستان تقسیم کے نعرہ پر بنا۔ مسلمانوں کی طرف سے "ڈائرکٹ ایکشن" کی نوبت آجانے کے بعد بالآخر یہ تحریک کامیاب ہوئی اور فریق ثانی نے اس مطالبہ کو مان لیا کہ آبادی کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب تقسیم کی سرحدیں طے کرنے کا وقت آیا تو پاکستانی لیڈروں کو نظر آیا کہ تقسیم کے اصول کے مطابق "جوناگڑھ" اور "حیدرآباد" جیسی مسلم ریاستیں ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہیں۔ اب انھوں نے کوشش کی کہ دیسی ریاستوں کے معاملہ میں الحاق کے اصول کو مبہم رکھا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ بیک وقت کشمیر پر بھی قبضہ کر لیں گے اور حیدرآباد پر بھی۔ کشمیر کو اس دلیل سے کہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، حیدرآباد کو اس لئے کہ وہاں کا حکمران مسلمان ہے۔ مگر یہ خود اپنے پیدا کردہ حالات کے منطقی نتائج سے انکار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا انجام الٹا ہوا۔ دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں پاکستان ایک کو بھی نہ پکڑ سکا۔

پاکستان بنا تو وہ دو ایسے الگ الگ حصوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک (مشرقی حصہ) واضح طور پر دوسرے کے مقابلہ میں عددی اکثریت رکھتا تھا۔ بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کی کوششوں سے پاکستان کے سابقہ دونوں حصوں میں سیاسی مساوات (Parity) قائم ہوگئی۔ صدر ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت میں یہ مساوات ایک مسلمہ سیاسی اصول کے طور پر باقی رہی۔ اس کے مطابق مشرقی حصہ کے چالیس ہزار اور مغربی حصہ کے چالیس ہزار نمائندہ ووٹر ملک کی حکومت کا فیصلہ کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے رہنما اس نظام کے خلاف ہو گئے۔ انھیں صدر ایوب کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور اس کی سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ عوام کو یہ کہہ کر ان کے خلاف بھڑکا دیا جائے کہ بنیادی جمہوریت قائم کر کے انھوں نے عوام کے سیاسی حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اب پاکستان میں تحریک جمہوریت چلائی گئی۔ بے پناہ نقصانات کے بعد بالآخر تحریک کامیاب ہوئی۔ صدر ایوب اور ان کی بنیادی جمہوریت دونوں ختم ہو گئے۔

۱۹۷۰ میں پاکستان کا پہلا عوامی انتخاب ہوا جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی آبادی چوں کہ زیادہ تھی، اس کے نمائندوں کی تعداد مرکزی اسمبلی میں زیادہ (۵۵ فی صد) ہوگئی۔ مساوات ٹوٹ گئی اور بنگلہ دیش نے پاکستان کے اوپر سیاسی بالاتری حاصل کر لی۔

اب پاکستان کے رہنما چیخ اٹھے۔ انھوں نے جمہوریت کے فتنہ کو یہ سمجھ کر جگایا تھا کہ وہ خود ان کو اقتدار تک پہنچانے کا زینہ بنے گی نہ اس لئے کہ بنگلہ دیش کے سیکولر لیڈر اس کو استعمال کر کے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے۔ انھوں نے چاہا کہ جمہوریت کو دوبارہ "پابند جمہوریت" بنائیں اور مشرقی اور مغربی حصہ میں مساویانہ نمائندگی

کا اصول قائم کریں جیسا کہ وہ پہلے قائم تھا۔ مگر عوامی جمہوریت کو زندہ کرنے کے بعد اس قسم کی کوشش خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج سے بھاگنے کے ہم معنی تھا۔ بنگلہ دیش عوامی رائے دہی کے اصول کے تحت ملی ہوئی سیاسی فوقیت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ جمہوری منطق کے تحت پیدا شدہ نتائج کے انکار نے نئے شدید تر مسائل پیدا کئے۔ دونوں حصوں میں کش مکش بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ خود پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔

۱۹۷۸ میں یہ تجربہ اب ایک نئی شکل میں دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستان کے دوسرے عوامی انتخاب (۱۹۷۷) میں بھٹو پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حزب مخالف کے لئے یہ سیاسی محرومی ناقابل برداشت تھی۔ اس نے الکشن کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ بھٹو پارٹی دھاندلی کرکے الکشن جیتی ہے۔ ورنہ پاکستانی عوام کی ننانوے فی صد اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ انھوں نے "دوبارہ الکشن کراؤ" کے نام پر پاکستانی شہروں میں ہنگامے شروع کر دیئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر فوجی افسروں نے بغاوت کر دی اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے جنرل محمد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ صرف ریفری کے طور پر حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے ہیں اور بہت جلد منصفانہ الکشن کرائے جائیں گے۔

پاکستان قومی اتحاد کے لیڈر خوش ہو گئے اور ۱۹۷۷ کو "عام الفتح" قرار دیا۔ مگر بھٹو پارٹی کے جلسوں میں عوام کی بھیڑ نے بتایا کہ بھٹو کے بے اقتدار ہونے کے باوجود عوام اب بھی اسی کے ساتھ ہیں اور اگر الکشن ہوا تو بھٹو پارٹی ہی دوبارہ برسر اقتدار آ جائے گی۔ جس جمہوریت کو لانے کے لئے پاکستانی رہنماؤں نے چوتھائی صدی خرچ کر دی تھی وہ جب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ساری کی ساری "بھٹو" جیسے لوگوں کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ مسئلہ صرف جمہوری انتخابات کا نہیں ہے بلکہ "مسئلہ انتخابات کی پیش آمدہ مصیبت اور ان کے متوقع بھیانک نتائج کا بھی ہے"۔ اب انھوں نے اپنے نعرے بدل دیئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "جمہوریت کو جلا ڈالو۔ لوگوں کی آزادیاں سلب کر لو۔ عمر کا کوڑا حرکت میں لاؤ (المنبر، فیصل آباد ۳ اکتوبر ۱۹۷۸) یہی پاکستان کے تمام مخالف بھٹو رہنماؤں کا ذہن ہے۔ کوئی اس بات کو بھدے الفاظ میں کہہ رہا ہے اور کوئی خوبصورت الفاظ میں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی سیاست خود اپنے پیدا کردہ حالات کے نتائج کو قبول نہ کرنا ہے۔ جب پاکستان میں عوامی جمہوریت کو زندہ کیا گیا ہے تو اب یہ ممکن نہیں کہ اس کے منطقی نتائج کو ظہور میں آنے سے رد کیا جا سکے۔ پاکستانی رہنماؤں کی یہ سیاست بلاشبہ ان کے لئے نہایت مہنگی پڑے گی۔ "نظام مصطفیٰ" اور "نظریہ پاکستان" جیسے الفاظ بول کر اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس قسم کی غلطی بار بار کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ "سیاسی حرص" ہے۔ ہمارے رہنما صرف اتنے پر قانع ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں جو حقیقی حالات کے اعتبار سے انھیں مل سکتا ہے۔ ان کی اس کمزوری نے انھیں غیر حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ ایسے اقدامات کرتے ہیں جن کو نبھانے کی طاقت ان میں نہیں ہوتی۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اگر وہ حرص کے بجائے قناعت کا طریقہ اختیار کریں تو وہ زیادہ بڑی اور حقیقی کامیابی حاصل کریں اور قوم کو بھی نئے نئے مسائل سے دوچار کرنے کی ذمہ داری سے بچ جائیں۔ (۲۳ اکتوبر ۱۹۷۸)

سیاست کے ساتھ دینی خدمت کا کام نہیں کیا جا سکتا

شمالی نائجیریا کی ۶۵ ملین آبادی میں آدھے سے زیادہ مسلمان ہیں۔ دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ شمالی نائجیریا کے سلطان بیوا نے ریاست کے علما کو اپنے دربار میں بلایا اور ان کو تحفے دئے۔ آنے والوں میں ایک بزرگ نے تحفہ قبول نہیں کیا۔ یہ عثمان دان فودیو (۱۷۵۴ — ۱۸۱۷) تھے۔ انھوں نے کہا: میں آپ کا تحفہ اس وقت لوں گا جب کہ آپ مجھ کو تبلیغ اسلام کا پروانہ عطا فرمائیں — سلطان نے فوراً اُن کے مطالبہ کو مان لیا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا۔ ان کی کوششوں سے نائجیریا کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔

تاہم یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ عثمان دان فودیو نے اس کے بعد سلطان کے سامنے سیاسی مطالبات رکھنے شروع کئے۔ "تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرو، ٹیکس کی شرح گھٹاؤ، وغیرہ"۔ اس قسم کے مطالبات نے حکمرانوں کو خفا کر دیا۔ سلطان بیوا کسی طرح ان کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا سلطان نفاتا تخت پر بیٹھا۔ اس نے نہ صرف عثمان دان فودیو کے سیاسی مطالبات کو رد کیا بلکہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی پابندی لگا دی۔ اب عثمان دان فودیو اور ان کے ساتھی سلطان کے سیاسی مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ ۱۸۰۹ میں اس باہمی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا جو عثمان داں فودیو کی موت (۱۸۱۷) تک ناکام طور پر جاری رہا۔ احمدو بلو انھیں عثمان دان فودیو کے لڑکے تھے جن کو اپنے باپ سے ایک طرف تبلیغی جذبہ کی وراثت ملی تھی اور اسی کے ساتھ سیاسی جہاد کی بھی۔ عجیب بات ہے کہ احمدو بلو نے اپنے والد کے انجام سے کوئی سبق نہیں لیا اور اسی تجربہ کو پھر دہرایا جو ان کے پیش رو کے زمانہ میں ناکام ہو چکا تھا۔

"میری کوششوں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۶۳ سے لے کر مارچ ۱۹۶۵ تک تقریباً دو لاکھ مشرکوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سماجی زندگی میں نمایاں مقام رکھتے ہیں"۔

یہ نائجیریا کے سابق وزیر اعظم الحاج احمدو بلو (۱۹۰۱ — ۱۹۶۶) کے الفاظ ہیں جو انھوں نے ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کی موتمر اسلامی (قاہرہ) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ افریقہ کی لگ بھگ ۲۲ کروڑ آبادی میں دس کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

اگر مسلم ملکوں کی مدد شامل حال ہو تو افریقہ کے مشرک قبائل میں تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت خود میری وہ کامیابیاں ہیں جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا"

احمدو بلو کو اسلام کی خدمت کا یہ جذبہ اپنے دادا عثمان ڈان فوڈیو سے ملا تھا۔ ۱۹ویں صدی میں جب پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے افریقہ کے علاقوں میں گھسنا شروع کیا تو افریقہ میں اس کے رد عمل کے تحت بہت سے مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھیں میں سے ایک عثمان ڈان فوڈیو بھی تھے۔ انھوں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی اصلاح اور استعماری طاقتوں کے خلاف جہاد کی زبردست تحریک چلائی۔ دریائے نائجیریا کے کنارے کنارے دور تک انھوں نے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔ ۱۸۳۳ میں ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے

یہ مہم جاری رکھی۔ نائجیریا کی راجدھانی لاگوس سے لے کر شمال میں لکوتو شہر تک مقابلے جاری تھے۔ تاہم آخری فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ انھوں نے ۱۸۸۶ میں سلطان محمد طاہر اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر نائجیریا پر قبضہ کر لیا۔

احمد و بلو انھیں رنایات کے درمیان موجودہ صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ سوکوتو کے امیر قبیلہ تھے۔ ابھی وہ دس سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ماں ایک دیندار خاتون تھیں۔ قدیم رواج کے مطابق پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۲۱ سال کی عمر تک دینی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۶ میں مغربی تعلیم کے لئے کاسینا کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی زبان اور ریاضیات کی تعلیم مکمل کی۔ خاندانی وراثت کے تحت ان کو سکوتو کا امیر بنایا گیا۔ ۱۹۴۴ میں سلطان حسن نے ان کو شہر رباح کا گورنر مقرر کیا۔

۱۹۳۸ میں جب سلطان حسن کا انتقال ہوا تو نئے سلطان ابوبکر نے احمد و بلو کو سوکوتو کے "سار دونا" کے منصب پر سرفراز کیا۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے لندن کا سفر کیا اور آزادی کے مسائل پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کی۔

۱۹۶۳ کی مردم شماری کے مطابق نائجیریا میں ۳۶ ملین مسلمان ہیں، عیسائی ۱۹ ملین اور دوسرے قبائل ۱۰ ملین ہیں۔ شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور جنوبی نائجیریا میں زیادہ تر عیسائی۔ احمد و بلو شمالی نائجیریا کے لیڈر تھے۔ وہ مغربی استعمار کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۰ میں نائجیریا آزاد ہوا تو وہاں ایک فیڈرل گورنمنٹ بنی۔ اس حکومت کے فیڈرل پرائم منسٹر سر ابوبکر تفاوا بلیوا (۱۹۶۶-۱۹۱۲) تھے۔ احمد و بلو شمالی نائجیریا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ ایک مخلوط حکومت تھی جس میں مختلف پارٹیوں کے نمائندے اور اور مسلمان اور عیسائی دونوں شریک تھے۔ احمد و بلو نے مسلمانوں کی اصلاح و تعمیر اور عیسائیوں میں اسلام کی اشاعت کا کام پوری توجہ سے شروع کیا۔ اس کے نتائج بھی نکلنے شروع ہوئے۔ مگر انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ۱۵؍ جنوری ۱۹۶۶ کو ۲۵ فوجی افسروں نے مل کر بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں ابوبکر تفاوا بلیوا، احمد و بلو اور بہت سے مسلمان اور عیسائی مارے گئے۔ اس کے بعد نائجیریا میں فوجی حکومت قائم ہو گئی جس کے سربراہ جنرل اردنسی تھے۔ مگر انھیں بھی صرف چھ ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ۲۹؍ جولائی ۱۹۶۶ کو دوسری فوجی بغاوت ہوئی اور وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔

نائجیریا میں دو مسئلے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد ستر فی صد ہے۔ مگر تعلیم، اقتصادیات اور تنظیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے عملاً اکثر شعبوں پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بلند کیا جائے تاکہ وہ ملک میں اپنا جائز مقام پا سکیں۔ دوسرا کام یہاں کے عیسائیوں اور خاص طور پر ۱۰ ملین مشرک قبائل میں اسلام کی اشاعت ہے۔ یہ دونوں کام احمد و بلو نے شروع کر دیئے تھے۔ مگر ان کی شہادت سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ کہ تعمیر و تبلیغ کا کام سیاست کو لے کر نہیں کیا جا سکتا۔ احمد و بلو اگر سیاست سے الگ ہو کر یہ کام کر رہے ہوتے تو وہ ۲۰-۲۵ برس میں نائجیریا کی تاریخ بدل دیتے۔ مگر سیاست کے خارزار نے انھیں بھی ختم کر دیا اور ان کے ملی اور اسلامی کام کو بھی □

جب ذہن کے پردے ہٹ جائیں

ملک عبدالشکور بی اے (پیدائش ۱۹۴۶) بُدھل (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ وہ سگرٹ کے عادی تھے اور روزانہ تین پیکٹ پی جاتے تھے۔ ”سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے“ ”سگرٹ پینا اپنے کمائے ہوئے پیسہ کو آگ لگانا ہے“ اس قسم کی کوئی بھی دلیل ان کو سگرٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں کرسکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی اصرار کرکے پلاتے۔ چار پینے کے بعد وہ سگرٹ کا کش لینے کو اتنا ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اپنے دوستوں سے کہتے ”جو آدمی چائے پی کر سگرٹ نہ پیئے اس کو چائے پینے کا حق نہیں“

مگر ایک چھوٹے سے واقعہ نے ان کی محبوب سگرٹ ان سے چھڑادی۔ سگرٹ کے ٹکڑے جو وہ پینے کے بعد پھینکتے ان کو ان کا تین سالہ بچہ فاروق قیصر اٹھالیتا اور منھ میں لگاکر پیتا۔ ملک عبدالشکور صاحب اس کو منع کرتے مگر وہ نہ مانتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بچہ کی ماں نے سختی سے بچہ کو منع کیا تو بچہ نے کہا: ”ابا بھی تو پیتے ہیں“، ملک عبدالشکور صاحب نے بچہ کی زبان سے یہ سنا تو ان کو سخت جھٹکا لگا۔ اگرچہ وہ دوستوں کے سامنے اپنی سگرٹ نوشی پر قصیدہ پڑھتے تھے مگر ان کا دل خوب جانتا تھا کہ سگرٹ پینا ایک بری عادت ہے جس کا انجام نہ صرف صحت اور پیسہ کی بربادی ہے بلکہ وہ اخلاق کو بھی بگاڑنے والا ہے۔ جب کوئی شخص ان سے سگرٹ چھوڑنے کو کہتا تو وہ اس کے خلاف لفظی دلائل کا انبار لگا دیتے۔ مگر ان دلائل کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ”نشہ“، کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ اپنی غلطی کو مان لیں۔ اس لئے وہ لفظی تاویلات کے سہارے اپنے کو حق بجانب ثابت کرتے تھے۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ سگرٹ کے خلاف کسی دلیل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔

مگر جب سگرٹ کا سوال بچہ کی زندگی کا سوال بن گیا تو اچانک وہ سنجیدہ ہوگئے۔ ان کے ذہن سے وہ تمام پردے ہٹ گئے جنھوں نے ایک سادہ سی حقیقت کو سمجھنا ان کے لئے ناممکن بنا دیا تھا۔ جو شخص مضبوط دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوتا تھا وہ ایک بچہ کے کمزور الفاظ کے آگے بالکل ڈھ گیا۔ ”اگر میں خود سگرٹ پیتا رہوں تو میں اپنے بچہ کو سگرٹ پینے سے باز نہیں رکھ سکتا“، انھوں نے سوچا۔ بچہ کا یہ کہنا کہ ”ابا بھی تو پیتے ہیں“ ان کے لئے ایک ایسا ہتھوڑا بن گیا جس کی ضرب کو برداشت کرنے کی طاقت ان کے اندر نہ تھی۔ بچہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ان کو سخت جھٹکا لگا۔ انھوں نے ایک لمحہ کے اندر وہ فیصلہ کرلیا جس کے لئے ان کے دوستوں کی مہینوں اور سالوں کی کوشش بھی ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ انھوں نے طے کرلیا کہ وہ سگرٹ پینا بالکل چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے نہ صرف اگلے دن سگرٹ نہیں پی بلکہ مستقل طور پر سگرٹ نوشی ترک کردی۔

باپ کو سگرٹ سے محبت تھی۔ مگر بیٹے سے اس سے زیادہ محبت تھی۔ اس نے بیٹے کی خاطر سگرٹ کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہر آدمی کو اپنے مفادات اور مصلح سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ خدا کی محبت اتنی بڑھ جائے کہ اس کی خاطر آدمی دنیا کے مفادات اور مصالح کو قربان کردے۔ (۲۰ ستمبر ۱۹۷۹)

اسی سے تعمیرِ دنیا بھی

ایک مرتبہ مجھے مسلم نوجوانوں کے ایک اجتماع میں بلایا گیا۔ میں نے وہاں آخرت کے موضوع پر کچھ باتیں عرض کیں۔ میں نے کہا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور آخرت کی فکر رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ میں اپنی بات پوری کرکے چپ ہوا تو ایک نوجوان نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے، اب اصل بات شروع کیجئے" ان کو کسی نے بتایا تھا کہ میں "تعمیرِ ملت" کے موضوع پر کچھ باتیں پیش کروں گا۔ "آخرت" کا وعظ سن کر انھیں محسوس ہوا کہ میں نے اصل بات نہیں کہی، میں نے مسلمانوں کے دنیوی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر آخرت کی تعمیر سے الگ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیرِ آخرت ہی میں تعمیرِ دنیا کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ دنیا کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایک باشعور قوم بنیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اقتصادی خوش حالی حاصل ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک طاقتور قوم ہوں۔ اور یہ تینوں چیزیں آخرت کے عقیدہ سے کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ آخرت کا عقیدہ انسانی شعور کو بیدار کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ آخرت پسندی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جائے۔ جس آدمی کا شعور اتنا بیدار ہو کہ وہ نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھنے لگے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اور بھی زیادہ دیکھنے والا بن جائے گا۔ آخرت کوئی رسمی عقیدہ نہیں، وہ انسان کے شعور کو آخری حد تک جگا دینے والی سب سے بڑی انقلابی تدبیر ہے۔ آخرت کے عقیدہ سے سنجیدگی اور احتیاط پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو سوچنے والا اور حقیقت پسند انسان بناتا ہے۔ ایسا آدمی ہر معاملہ کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی اصلیت اور واقعیت کے اعتبار سے جانچنے لگتا ہے نہ کہ محض ان کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔ یہ باتیں جس کے اندر پیدا ہو جائیں وہ سب سے زیادہ باشعور انسان بن جاتا ہے، وہ دنیا سے لے کر آخرت تک تمام چیزوں کو خدائی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

اس کی بہترین واقعاتی مثال صحابہ کرام کا گروہ ہے۔ انھوں نے مشکل ترین حالات میں دعوت اسلامی کے کام کو منظم کیا اور قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ کو نہ صرف مسلمان بنایا بلکہ ان کی زبان اور تہذیب تک کو بدل ڈالا۔ یہ سب کام وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے اگر وہ شعور کی اعلیٰ سطح پر نہ پہنچ گئے ہوتے۔

۲۔ اقتصادی ترقی ہمیشہ دو چیزوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محنت اور دیانت داری۔ اور آخرت کے عقیدہ سے یہ دونوں چیزیں کمال درجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ عمل کئے بغیر کسی کو کوئی انعام نہیں مل سکتا۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو بتاتا ہے کہ خدا کے یہاں صرف سچائی اور اخلاص کی قیمت ہے،

جھوٹ اور فریب کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس طرح جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت پسند ہو جائے وہ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر محنتی اور دیانت دار بن جاتا ہے۔ اور جس شخص کے اندر یہ دونوں خصوصیات پیدا ہو جائیں وہ صفر سے آغاز کرکے بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اقتصادیات کی دنیا میں کسی کے لئے سب سے بڑا سرمایہ محنت اور دیانت داری ہے اور یہ دونوں چیزیں آخرت کے عقیدہ کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ جس شخص کے اندر آخرت کا احساس ہوگا اس کے اندر لازمی طور پر محنت بھی ہوگی اور دیانت داری بھی۔

اس کی ایک واضح مثال صحابہ و تابعین کا گروہ ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے۔ مادی وسائل کے اعتبار سے کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے وقت کی تجارتوں پر قبضہ کر لیا، وہ ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک کی منڈیوں پر چھا گئے۔ ان کی اس اقتصادی کامیابی کا راز یہی دو چیزیں تھیں —— محنت اور دیانت داری۔

۳۔ کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ اتحاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کا دوسرا نام طاقت ہے اور اختلاف کا دوسرا نام کمزوری۔ کسی گروہ کے افراد میں جب اتحاد ٹوٹتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہوتی ہے اور وہ افراد کی انانیت ہے۔ اگر ہر فرد میں تواضع آجائے، ہر آدمی اپنی "انا" کو ختم کر چکا ہو تو وہاں اختلاف کا سرے سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور آخرت کا عقیدہ سب سے زیادہ یہی چیز پیدا کرتا ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا کی ہیبت اور آخرت کا فکر بیٹھ جائے اس کے اندر سے گھمنڈ اور بڑائی کے تمام احساسات نکل جاتے ہیں۔ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو ایک بے "میں" والا انسان بنا دیتا ہے۔ یہی کیفیت اتحاد کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ جس قوم کے افراد سے گھمنڈ اور انانیت نکل جائے ان کے اندر سے گویا اختلاف کی جڑ ختم ہو گئی۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ متحد قوم بن جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں اتحاد سے بڑی کوئی دوسری طاقت نہیں

اس کی واقعاتی مثال اسلام کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جو لوگ تیار ہوئے وہ بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے تھے۔ چنانچہ ان ابتدائی مسلمانوں میں بے پناہ اتحاد پایا جاتا تھا۔ اسی اتحاد کی طاقت سے انھوں نے اپنے سے زیادہ طاقت ور اور اپنے سے زیادہ سامان والے دشمنوں کو مغلوب کر لیا۔ مگر بعد کے دور میں جو لوگ اسلام کی صفوں میں شامل ہوئے ان میں آخرت کا عقیدہ اتنا گہرا اور اتنا زندہ نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ اس کی بات مانی جائے، اس کی بڑائی تسلیم کی جائے، اس کے نتیجہ میں ایسا اختلاف پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ لوگ جو اب تک کفر و شرک کا زور توڑنے میں لگے ہوئے تھے وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے میں لگ گئے۔